راجہ رام موہن رائے

سچندر لال گھوش

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

راجہ رام موہن رائے

راجہ رام موہن رائے

مصنف

سچندرلال گھوش

مترجم

انعام الحق

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل

حکومت ہند

ویسٹ بلاک-1، آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066

Raja Ram Mohan Roy

By: Sachinder Lal Ghosh

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت :

پہلا اڈیشن : 1973

تیسرا اڈیشن : 2002 تعداد: 1100

قیمت : =/16

سلسلہ مطبوعات : 996

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ویسٹ بلاک۔ I، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

طابع : جے۔کے آفسیٹ پرنٹرز، جامع مسجد، دہلی۔ 110006

پیش لفظ

پیارے بچوں! میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے کائنات میں نیک و بد کی تمیز آجاتی ہے اس سے کردار بنتا ہے اور شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے، یہ سب ہونے کے بعد زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اس لئے کسی بھی زبان کا ادب خواہ انگریزی ہندی یا اردو کا، ادب کا مطالعہ زندگی کو کامیابی سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

ہمارا بچوں کا ادب اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے ہماری کتابوں کا مقصد تمہارے دل و دماغ کو روشن کرنا ہے اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات اور نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے اس کے علاوہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جن سے تم سبق حاصل کر سکو اور اپنے لئے نئی منزلیں متعین کر سکو یاد رکھو اردو زبان کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھاؤ۔ تاکہ اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں ہمارا ہاتھ بٹا سکو۔ اسی لئے قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے۔ اپنے پیارے بچوں کے ذخیرۂ علم میں اضافہ کرنے کے لئے نئی نئی دیدہ زیب کتابیں شائع کرتا رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

دیباچہ

یہ بخوبی واضح ہے کہ ہمارے اسکول کے بچّوں کے لیے موزوں قسم کی ضمنی کتابیں کم یاب ہیں اگرچہ ہر کوئی اس ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قومی انجمن برائے تعلیمی تحقیق و تدریس (این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی) نے اِس قسم کے ادب کی اشاعت کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا ہے جو ۱۴ سال سے ۱۷ سال تک کی عمر کے بچّوں کی ضروریات اور اُن کے فہم و ادراک کے لحاظ سے موزوں ہو۔ انجمن کی یہ ایک نئی مہم ہے اور اس کا ایک حصّہ "ہماری میراث" پر مختصر رسالوں کی اشاعت کے لیے وقف کیا گیا ہے۔

ہمارا مقصد اس عمر کے بچّوں کو اُن تحریکوں اور شخصیتوں سے متعارف کرانا ہے جو ہمارے ماضی کے کچھ قابلِ ترک پہلوؤں سے کنارہ کش ہو گئے تھے اور جو مستقبل کے لیے نئی پگڈنڈیوں کو روشن

کر رہے تھے۔ "جدید مصلحین" کا مقصد جس کو ہم نے اِس سِلسلہ کے لیے منتخب کیا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں روایات کی تصویر کو نمایاں کرنا ہے۔ اِس میں مواد کو اس انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید مصلحین کی شخصیتوں اور اُن کے کارناموں کا مطالعہ کرنے والوں میں قدر دانی کا احساس پیدا ہو سکے۔

اِس مختصر سی کتاب میں جدید ہندوستان کے ایک رہنما راجہ رام موہن رائے کے سوانح حیات اور ان کے کارناموں کو مختصر اور جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ کتاب حتی الوسع زیادہ سے زیادہ تعداد میں اسکول کے بچوں تک پہنچے گی اور ملک کے تمام تعلیمی اداروں میں اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

اگر یہ اشاعت نیز اسی سِلسلہ کی دوسری اشاعتیں ہمارے نوجوان طلباء کے ذہنوں پر خاطر خواہ اثر انداز ہو سکیں تو ہم سمجھیں گے کہ ہم نے اپنی محنت کا موزوں صِلہ پالیا ہے۔

پریم کرپال
31 مئی 1972ء

اظہارِ تشکر

مصنف راجہ رام موہن رائے کی زندگی اور ان کے کام کے حقائق کے لیے صوفیہ ڈاسن کالٹ کی سوانح نگاری کا مرہون منت ہے (جس کی طباعت دوم میں شری پربھات چندر گنگلے اور شری دلیپ کمار بسواس کے ضمنی نوٹس بھی شائع ہوئے ہیں)، لیکن ان حقائق کی اہمیت کا جائزہ مصنف کا اپنا ہے۔ اس قسم کی تصنیف میں ایک قابل یادگار شخصیت کی زندگی کے مخصوص واقعات ہی کو بیان کیا جا سکتا ہے جس نے زمانۂ جدید میں ہندوستان کی بیداری کے عمل کا آغاز کیا۔ مصنف اس مختصر کتابچے میں پیش کیے گئے حقائق کے انتخاب کی ذمہ داریوں کو تنہا قبول کر لینے کا خواہشمند ہے۔ اگر یہ کتابچہ نوجوان طلباء کے ذوق کو ہندوستان کی بیداری کی اُن خاص سمتوں میں اُبھارنے میں کامیاب ہوتا ہے جن کی طرف راجہ رام موہن رائے نے رہنمائی کی تھی اور جو ہندوستان کے قومی تخیل میں اب بھی ایک اہم مقام حاصل کیے ہوئے ہیں تو مصنف کو اس کی محنت کا کافی صلہ مل جائے گا۔

فہرستِ عنوانات

ابواب		صفحہ
	دیباچہ	3
	پیشِ لفظ	5
	اظہارِ تشکر	6
1	راجہ رام موہن رائے اور ان کا زمانہ	9
2	اوائل عمری	24
3	سب سے پہلا چیلنج	29
4	ترقی اور مخالفت	34
5	گھمسان لڑائی	44
6	نئے معرکے	56
7	مصنف و معلم	64
8	برہم سماج	73
9	ہندوستان کا سفیر	81
10	چراغ گل ہو جاتا ہے	94
11	رہنما (راستہ بنانے والا)	98

"خدمتِ خلق ہی خدا کی خدمت ہے"
رام موہن رائے

۱۔ راجہ رام موہن رائے اور اُن کا زمانہ

رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا ہے کہ راجہ رام موہن رائے سے ہندوستان میں جدید زمانے کا آغاز ہوا۔ وہ اُس زمانے میں پیدا ہوئے جبکہ ہمارا ملک اپنی اندرُونی صداقت کا رشتہ کھو چکا تھا اور ماحول کی ذلت آمیز غلامی میں پامال کر دینے والے بے وجہ بار سے تنگ آکر ہاتھ پَیر مار رہا تھا۔ اُس وقت ہم نے زوال پذیر روایات پر مبنی سماجی رواج، سیاسیات اور مذہب و فن کے حلقے میں غیر فطری عادات کو اختیار کر کے اپنی انسانیت کو بروئے کار لانا ترک کر دیا تھا۔ ہندوستان کی پستی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں راجہ رام موہن رائے تاریخ ہند کے آسمان پر درخشاں ستارے کی طرح نمودار ہوئے۔ وہ اس صدی کے بہت بڑے رہنما تھے جنھوں نے اُن بھاری رکاوٹوں کو دُور کیا جو ہر قدم پر ہماری ترقی میں مزاحم تھیں اور

ہمیں انسانیت کے عالمگیر تعاون کے موجودہ دور سے رُوشناس کیا۔
راجہ رام موہن رائے عالمِ انسانیت میں اپنے زمانے کے تنہا ایسے شخص تھے۔
جنھوں نے جدید زمانہ کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کیا۔ انھوں نے
قومی زندگی کے ہر ماحول کو ایسی علمی بصیرت اور دانائی بخشی جس کو ہم عالمگیر
روشنی میں خدا کے ظہور کی رُوح سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

استدلالی نظریہ کی ضرورت:

موجودہ زمانہ جس کی طرف ٹیگور نے اشارہ کیا ہے انسان کے لیے
فکر و شعور اور دنیا کی قوموں کے درمیان باہمی اتحاد اور تعاون کا دور ہے۔
یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ دُنیا کی تمام قومیں آزاد ہوں اور مساوات
کی مضبوط بنیاد پر مل جُل کر رہ سکتی ہوں۔ راجہ رام موہن رائے سب سے پہلے
ہندوستانی ہیں، جنھوں نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کو استدلالی
نظریہ اختیار کرنا چاہیئے تاکہ وہ قومی حیثیت سے ترقی کر سکیں۔ ایک قوم
کے لیے کسی ایک ہی مذہب کا ہونا ضروری نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے
ایک ریاست اور ایک مشترک اقتصادی اور سماجی فلسفہ کا ہونا لازم ہے۔
جس کے پیشِ نظر اُس کے تمام شہریوں کی بھلائی مقصود ہو۔ اس کے لیے
سیاسی آزادی کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ اپنی منزلِ مقصود کو بغیر کسی
مداخلت کے اپنی مرضی کے مطابق طریقے پر حاصل کر سکیں۔ سب سے پہلے

کہ ایک قوم میں مادی اور اخلاقی طاقت ہونی چاہیئے تاکہ وہ اپنی سالمیت اور اپنے اقتدار اعلیٰ کو دوسروں کے حملہ اور غلبہ کی تمام کوششوں سے محفوظ رکھ سکے۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت کا ظہور:

اٹھارھویں صدی کی آخری چوتھائی میں جب رام موہن رائے میدانِ عمل میں آئے تو اُس وقت ہندوستان مادی اور روحانی اعتبار سے بُری طرح منقسم تھا۔ وہ حکومت جس کو مغل بادشاہوں نے سولھویں اور سترھویں صدی میں تعمیر کیا تھا ایسے ٹکڑوں میں منتشر ہو چکی تھی جو آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے جس کی وجہ سے انگریزوں کے لیے یہ آسان ہوگیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی ہندوستانی گروہ کی مدد سے اُنھیں اپنی حکومت میں شامل کرلیں۔ صرف اشوک کے تحت جس نے ۲۳۰۰ سال پہلے حکومت کی ہے اور مغل بادشاہوں میں اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ زیب کے تحت ہی ہندوستان کا بیشتر حصّہ ایک حکومت کے زیرِ نگیں رہا۔ اس وقت بھی یہ بات فوجی طاقت کی بدولت حاصل تھی اور بہت سے چھوٹے حکمرانوں کو زیر کرکے اُن کی مرضی کے خلاف آسامی بنالیا گیا تھا جنھوں نے شاہی اقتدار کے کمزور پڑتے ہی بغاوت کردی اور آپس میں آخیر تک لڑتے جھگڑتے رہے۔ اس وقت تک پائدار اتحاد ممکن نہیں جب تک کہ لوگوں

کے مختلف گروہوں میں اپنی مرضی سے اشتراک نہ ہو اور شرکاء یہ محسوس نہ کریں کہ وہ ایک دوسرے کے محافظ ہیں ۔ انگریز جو شروع میں تجار کی حیثیت سے آئے تھے بڑی ہوشیاری سے ایک حکمراں کو دوسرے کے خلاف استعمال کرتے رہے اور تعجب خیز مختصر سے وقت میں ہندوستان کے اندر اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ انھوں نے دہلی میں شہنشاہ مغل کی حیثیت کو گھٹا کر اسے محض ایک وظیفہ خوار بنا دیا اور ۱۸۱۹ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے براہِ راست ہندوستان کے بیشتر حصے کو اپنی فرماں روائی میں لے لیا ۔

ابتر حالات :

۱۷۵۷ء میں بنگال کی فتح کے ساتھ ہی کمپنی نے ہندوستان میں جب حکومت بنانی شروع کی تو اس وقت حالات نہایت درہم برہم تھے اور برطانوی حکومت کے پچاس سال بعد بھی نظم و نسق قائم نہ ہو سکا تھا۔ انصاف اونچی بولیوں کے ساتھ نیلام ہوتا رہا اور سرکاری ملازمین قانونی عدالتوں میں بہت تھوڑی رقمیں پانے کی وجہ سے رشوت خور ہو گئے تھے۔ مقدمات کو اتنے عرصے تک چلایا جاتا کہ لوگ حقیقت میں انصاف سے محروم ہو کر رہ گئے ۔ بنگال لٹیروں کے گروہوں سے بھر گیا تھا جنھیں ڈاکوؤں کے نام سے موسوم کیا جاتا اور جن کو قلیل تنخواہ پانے والی رشوت خور پولیس

کی مدد کے باوجود مجسٹریٹ روکنے میں ناکام رہے۔ بڑے بڑے شہروں اور تجارت کے مراکز میں جرأت آمیز لوٹ مار کے واقعات ہوتے رہے اور دیہات تو مسلسل دہشت ہی کی حالت میں رہے جو اکثر ڈاکوؤں کے ممتاز سرداروں کو رشوت دیتے رہتے تھے۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۱۰ء تک ملک مسلسل خطرہ کی حالت میں رہا۔ مجسٹریٹ اور پولیس بے جان ہو کر رہ گئے اور لوگوں نے خود کو اپنی قسمت کے حوالے کر دیا تھا۔

اِس غیر یقینی صورت حال سے سب سے زیادہ نقصان گاؤں کے اُن لوگوں کو اٹھانا پڑا جو ہندوستانی سماج کی ریڑھ کی ہڈی تھے اور ابھی تک ہیں۔ زمیندار لوگ جو ۱۷۹۳ء کے استمراری بندوبست کے تحت زمین کے مستقل مالک بن گئے تھے، کسانوں پر بھاری لگان عائد کرنے لگے۔ بہت سے مقامات پر رعیت کے کسان لوگ اب تک بھی ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں اور کسی مزاحمت کا خیال دل میں لائے بغیر اپنے مالکوں کے ناجائز احکام اور نہایت غیر منصفانہ مطالبوں کی تعمیل کرتے رہتے ہیں۔ دیہاتی صنعت و حرفت کو انگریزی حکام کے ذریعے بزور دبا دیا گیا تاکہ برطانیہ کے کارخانوں سے تیار کیا ہوا تجارتی سامان بلا شرکت غیرے ملک میں درآمد کیا جا سکے۔ یہاں تک کہ نمک کی ذاتی صنعت کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ لوگوں میں مسلسل افلاس اور اخلاقی پستی کی صورت

میں ظاہر ہوا۔

سماجی حالات بھی اتنے ہی زیادہ خراب تھے۔ لوگوں کی زبردست اکثریت ہندو فرقہ سے تعلق رکھتی تھی جیساکہ آج بھی ہے۔ ہندو دھرم ایک ایسا مذہب نہیں ہے جس میں خدا کی ماہیت کے متعلق کسی خاص قسم کے مذہبی عقائد اور اعتقادات پائے جاتے ہوں بلکہ اس کے برعکس وہ اُن مختلف مذہبی اعتقادات کی ایک انجمن ہے جو ایک مشترک طرز زندگی کے ذریعے یا دوسرے لفظوں میں مخصوص علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے مشترک رسم و رواج، طور طریقوں اور سماجی تعلقات کے ذریعے یکجا کردیے گئے ہیں۔ ذات پات کے نظام نے، جس کی وجہ سے مختلف ذات کے گروہ باہم کھانے پینے اور شادی کرنے سے باز رہے اور ان مذہبی باتوں نے، جن کی بنا پر کچھ مخصوص کھانے پینے کی چیزیں ممنوع سمجھی گئیں اور ایسے سخت رسم و رواج بنے، جن کی وجہ سے کچھ مخصوص ذاتوں کے افراد کے صرف چھو دینے سے کھانے پینے کی چیزوں اور جسم کو ناپاک سمجھا گیا ہندو قوم کو بہت سے ایسے گروہوں میں تقسیم کردیا تھا جن کے درمیان مضبوط باہمی تعلقات باقی نہیں رہے تھے۔ خود بھگتوں اور ہندوؤں اور دوسرے فرقوں کے درمیان اتحاد کا کوئی جتن نہ تھا اور نہ ہی اُس وقت ہندو دھرم کوئی ایسا پھلا پھولا مذہب تھا جیساکہ وہ زمانہ گزشتہ میں عروج پائے

ہوئے تھا۔ ہندو فلاسفی کو جو اُپنشد اور گیتا کی تعلیمات اور رشیوں کی حکیمانہ تشریحات پر مشتمل ہے لوگوں نے قطعی طور پر بھلا دیا تھا اور زیادہ تر نظر انداز کر دیا تھا۔ پنڈتوں کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق طرزِ عمل کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی تھی اور ان کی ہدایات پر بلا عذر عمل کیا جاتا تھا نیز اُن مذہبی رسوم و ارکان کی پابندی کی جاتی تھی جن کی پشت پر کوئی دلیل نہ تھی۔ سماجی فضا پرانے زمانے کے اُس ماحول سے بہت مختلف تھی جبکہ ہندوؤں نے اپنے زمانے کی بہترین تہذیب و ثقافت یعنی فنون و سائنس فلاسفی اور علوم کی دوسری شاخیں اپنا کر اپنی زندگیوں کو مالا مال کر لیا تھا لیکن دو سو سال قبل کے ہندو زندگی کے اپنے ان روایتی طریقوں میں کسی بھی تبدیلی کے سخت مخالف تھے۔

ہندوستان۔ مذاہب کی جائے پیدائش و جائے پناہ:

ہندوستان دُنیا کے بہت سے موجودہ مذاہب کی جائے پیدائش ہی نہیں رہا ہے بلکہ گزشتہ دو ہزار سالوں میں دوسرے اُن مذاہب کے لیے جن کی ابتدا دوسرے مُلکوں میں ہوئی ہے جائے پناہ و عبادت گاہ بھی بنا رہا ہے۔ قدیم عیسائیوں، یہودیوں اور پارسیوں نے ہندوستان ہی کو محفوظ مقام سمجھا۔ شروع میں مسلمان حکمراں حملہ آوروں اور بحری ڈاکوؤں کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے لیکن وہ بعد کو یہیں آباد ہو گئے

اور اچھے ہندوستانی بن گئے۔ انھوں نے لوگوں کو اپنے مذہب میں شامل کیا اور وہ بھی دوسروں کی طرح یہاں کے قدرتی باشندے بن گئے اگرچہ مختلف فرقے پہلو بہ پہلو رہتے رہے لیکن وہ متوازی سماج کی حیثیت سے رہے۔ ایک نے دوسرے کے تمدن پر اپنا اثر ڈالا مگر ہر ایک کا سماجی ڈھانچہ اور عقیدہ بے لوچ رہا۔ بالخصوص ہندؤں نے دوسرے طبقوں کے افراد کے ساتھ اچھوتوں کا سا برتاؤ کیا جیساکہ وہ اپنے ہی فرقہ کے بہت سے لوگوں کے ساتھ کرتے تھے۔ جس وقت اسلام اور سکھ مذہب نے یہ تلقین کی کہ ہر فرد سماجی حیثیت سے مساوی حقوق رکھتا ہے جس کے نتیجہ میں ان کے اندر ایک باہمی ربط پیدا ہوگیا تھا اس وقت ہندو دھرم نے اپنے بہت سے افراد کو مساوی حیثیت بخشنے سے انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ سولھویں اور سترھویں صدی کی مذہبی تحریک بھی مختلف ذاتوں اور طبقوں کے لوگوں کو باہم ملانے میں ناکام رہی اگرچہ وہ لوگ مذہبی سوجھ بوجھ اور مختلف طبقوں کے درمیان رواداری کو ترقی دینے میں کامیاب رہے لیکن تقریباً تمام طبقے (پارسیوں میں سے کچھ نمایاں شخصیتوں کو چھوڑکر) مغرب کے جدید کلچر کو مشتبہ سمجھنے اور ہندوستان میں اس کی پیش قدمی کو روکنے میں متفق تھے۔

کم خواندگی اور پسماندگی: اُس وقت کسی ایک آدھ فرقہ ہی میں تھوڑے

بہت آدمی لکھے پڑھے تھے اور اُن کے نزدیک تعلیم کا معیار صرف یہ تھا کہ وہ مذہبی اور سنسکرت، عربی و فارسی کی دوسری کتابیں پڑھ سکیں۔ جہالت کی اس فضا میں لوگ اوہام پرستی میں اعتقاد رکھتے اور ستی (بیوائوں کا اپنے شوہروں کے ساتھ آگ میں جل جانا) جیسے بھیانک اور خلافِ انسانیت رواجوں کی اندھی تقلید کرتے تھے۔ عورتوں کی حالت تو بہت ہی زیادہ ابتر تھی۔ اُنھیں حصولِ تعلیم سے روکا جاتا اور الگ پردہ میں رکھا جاتا۔ مردوں کے مقابلے میں اُنھیں بہت کم قانونِ حقوق سے استفادہ موقعہ دیا جاتا۔ کم سنی میں بچوں کی شادی اور کثرت ازدواج کا رواج عام تھا۔ مختصر یہ کہ ہندوستان اٹھارھویں صدی کے آخر میں ایک محدود ماحول کے اندر زندگی گزار رہا تھا جو روز بروز بدتر صورت اختیار کرتا جا رہا تھا اور اُن بڑے انقلابات سے بے خبر تھا جو مغربی ممالک میں واقع ہو رہے تھے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اس صورت حال کو "سکونِ گور" سے تعبیر کیا ہے انگریز جو تجارت کی غرض سے آئے تھے لیکن حکومت کرنے کے لیے رہ گئے ہندوستان کے تہذیبی ورثہ اور ہندوستان میں طرزِ جدید کی ابتدا کرنے میں کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ عیسائیت کی تبلیغی جماعتوں نے جو بڑی تعداد میں یہاں پہنچنے لگی تھیں، ہندوستانیوں کو عیسائیت میں تبدیل کر کے اُن کی رُوحوں کو نجات دینے کی مہم شروع کی۔ ایک تاثر یہ پیدا

کیا گیا کہ غیر ملکیوں کا اقتدار اس عیسائی مذہب کی وجہ سے ہے جس کی وہ تبلیغ کرتے ہیں۔ اس تاثر نے اور اہلِ یورپ کے پیش کردہ جدید نظریہ نے ہندوستان کے روایت پسندوں کو ایک نیا اور زبردست چیلنج دیا۔ اُس وقت کے ہندو سماج کو جو انتشار اور اخلاقی پستی میں مبتلا تھا یہ ایک بڑی دھمکی دکھائی دی کیونکہ یہ نا سمجھ اوہام پرستوں اور روایت پسندوں کے لیے علم و معقولیت کا ایک چیلنج تھا اور رسمی ہندویت کے حامیوں کے دلوں میں یہ زبردست خطرہ محسوس ہوا کہ وہ زیادہ عرصے تک اس کو روک نہ سکیں گے۔ بہر حال لوگوں نے یہ سوچنے میں غلطی کی کہ یورپی اقتدار اور برتری عیسائیت کی وجہ سے تھی۔ حقیقت میں یہ آزادئ خیال کا جوش، رسم و رواج سے اختلاف کرنے کی جرأت اور علمی دلائل کا ذوق تھا جس نے روایتی ہندو دھرم کے لیے ایک خطرہ پیدا کر دیا تھا۔

سادہ معیارِ زندگی:

لوگوں کا معیارِ زندگی بہت سادہ تھا۔ وہ اس سے بہتر معیار کو اپنانے کا حوصلہ ہی نہ رکھتے تھے اور وہ اپنی بنیادی ضروریات کو اپنے کھیتوں اور کارخانوں ہی کی پیداوار سے پورا کر لیتے تھے۔ قرب و جوار کے دیہات مل کر عام طور پر ایک مکمل اقتصادی اور سماجی اکائی (UNIT) بنا لیتے اور اسی کے اندر منظم پیداوار اور سماجی رشتے جیسے شادی بیاہ وغیرہ

ہوا کرتے۔ اس لیے بہت ہی تھوڑے لوگ اپنے دائرہ سے باہر نکل و حرکت کی خواہش یا ضرورت محسوس کرتے ہوں اپنے حلقے سے باہر پھیلے ہوئے ملک کے حصوں کے بارے میں بہت ہی کم جانتے تھے اور ہندوستان متعلق ان کا کوئی خیال ملک واحد کی حیثیت سے نہیں تھا۔ معاشی حدود کے اندر ان کا ابتدائی تعلق صرف خاندان، قبیلہ اور برادری سے رہتا۔ اس سے وسیع تر وفاداری کا مفہوم ان کے اندر متحرک نہ تھا۔

واضح ہو کہ عہدِ وسطیٰ میں یورپ کی حالت اتنی ہی ابتر تھی جتنی کہ رام موہن کی پیدائش کے وقت ہندوستان کی تھی۔ تعصب، کٹرپن اور اوہام پرستی عام تھی۔ عہدِ وسطیٰ کے شروع میں پادری لوگ اس درجہ بااثر تھے کہ وہ ایسے لوگوں کو بے دردی سے کچل ڈالنے کے لیے حکمراں طبقہ کو مجبور کر سکتے تھے جو ان کی صحیح قرار دی گئی بات سے اختلاف کرتے۔ بہت سے مخالفوں کو قید کرا دیا گیا اور سخت عذاب دلایا گیا۔ انھیں قتل کر دیا گیا نیز زندہ جلا دیا گیا لیکن یہ تمام باتیں بھی انسان کی آزاد روح کو دبا نہ سکیں اور کھلی بغاوت ہو گئی۔ کچھ لوگ جرمنی اور انگلینڈ میں اس طور طریقے کے متعلق سوال کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے جن میں عیسائیت کے حقائق کی ترجمانی قدامت پسندوں کے ذریعے کی گئی تھی انھوں نے اس سے الگ ہو کر ایک نیا فرقہ بنا لیا۔ جس کو (PROTESTANTS) (احتجاج کنندگان

کہا گیا۔ انھوں نے عقلی دلائل اور تجربہ کی روشنی میں بائبل کی کتابوں کو پرکھنا شروع کیا اور فطرت کے حقائق کا مشاہدہ بھی کیا اور جہاں ممکن ہوا تجربات کیے اور اس طرح انھوں نے اشیاء نیز خدا کی ماہیت کے بارے میں کچھ نتائج اخذ کیے۔

جمہوریت کی بنیادیں :

جدید سائنس اور خیالات کے اس ابتدائی دَور میں یورپ کے اندر جدید زمانہ کا آغاز ہوا۔ سترھویں صدی کے آخری اور اٹھارھویں صدی کے تمام سالوں میں کچھ مفکروں نے سماج کی اصلیت اور ماہیت، سماج اور ریاست میں انسان کے حقوق اور فرائض اور خدا سے اُس کا تعلق وغیرہ سوالات پر غور کیا۔ پھر شہری آزادی، قومی شعور اور ایک شہری کو اپنے حکمراں منتخب کرنے کے حقوق کا سوال اُٹھا۔ رام موہن رائے کے اوائل عمری میں امریکی اور فرانسیسی انقلابات رونما ہوگئے۔ شمالی امریکہ میں انگریز آبادکاروں نے شاہ برطانیہ کی حکومت کے خلاف ۱۷۷۶ء میں بغاوت کردی اور ۱۷۸۱ء میں ایک آزاد جمہوری سلطنت قائم کرلی جو بعد میں متحدہ ریاستہائے امریکہ کے نام سے موسوم ہوئی جس کی صدارت ایک منتخب صدر کرتا تھا۔ فرانس میں اُن لوگوں نے جو ایک ایسے مطلق العنان بادشاہ کے محکوم تھے جو آبائی امراء اور پادریوں کے عملی تعاون سے

حکومت کر رہا تھا بغاوت کر دی اور شاہی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ۱۷۹۰ء
میں اس استحقاق کو موقوف کر دیا جس کو امرا اور پادریوں کا طبقہ حاصل کیے
ہوئے تھا اور انھوں نے جمہوری سلطنت کا اعلان کر دیا۔ ان انقلابات سے
کامیابی کے دو اہم نتائج برآمد ہوئے اول یہ کہ ہر شہری کے حقوق برابر
ہیں دوم یہ کہ سرکار عوامی منتخب نمائندوں کی ہونی چاہیئے اور انھیں کے
ذریعے چلائی جانی چاہیئے۔ فرانسیسی انقلاب کا مقصد بھی انسان کی آزادی،
مساوات اور اخوت تھا۔ جس وقت یہ سب کچھ ہو رہا تھا سائنس کا علم
نہایت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ بھاپ کی طاقت کی تحقیق اور اُس کے
استعمال نے بہت بڑے پیمانے پر پیداوار کو تیز دخانی جہازوں اور
ریل گاڑی کے ذریعے مال تیز رفتاری کے ساتھ اِدھر سے اُدھر لے جانے کو
ممکن بنا دیا تھا۔ بھاپ کی یہی طاقت صنعتی انقلاب کا باعث ہوئی۔
جمہوری سلطنت کا یہ نظریہ کہ سرکار عوام کی ہونی چاہیئے اور عوام ہی کے
ذریعے عوام کے لیے چلائی جانی چاہیئے ایک طاقتور مسلک کی صورت میں
پھیلتا گیا اور فرانسیسی انقلاب کا نصب العین (آزادی، مساوات، اخوت)
تمام ترقی پسندوں کے تحریک پھر سے سماجی غور و فکر کے لیے بنیاد بن گیا۔
مغربی ممالک میں کچھ ہم عصر مفکرین پہلے سے ہی مساوات کے اصول کو
اشاعت دے رہے تھے جس سے اُن کا مطلب یہ تھا کہ سب کی حیثیت

مساوی ہو اور سب کو برابر کے مواقع ملیں۔ اس طرح سوشلزم کے نظریہ کا آغاز ہوا۔

انگریزی زبان کی تعلیم:

ہندوستان میں اُس وقت صرف چند ہی آدمی تھے۔ جنہوں نے غیر ملکی لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے کے لیے انگریزی زبان سیکھنا شروع کیا تھا یہ وہ لوگ تھے جو براہِ راست انگریزوں کے ساتھ تجارتی کاروبار کرتے تھے اور جو اُن کے یہاں ملازم تھے لیکن وہ مغربی کلچر کو سمجھنے میں کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے اور نہ ہی وہ اپنے ذاتی مفاد سے زیادہ کچھ سوچ سکتے تھے۔ دُوسری طرف رام موہن سے کم عمر کچھ ہم عصر لوگوں نے ہندوستان کی تہذیبی روایات کو پورے طور پر مسترد کر دیا تھا۔ اُن کی یہ بغاوت ہندوستان کے سماج کی بنیادی اصلاح کرنے کے بجائے ایک آتش فشاں ہو کر رہ گئی۔ مجموعی حیثیت سے ہندوستانی سماج کی قیادت نے جدید زمانے کے اثرات کا مقابلہ کیا اگرچہ لوگ یہ دیکھ کر نہایت بے چینی محسوس کر رہے تھے کہ ان کے روایتی سماج کا ڈھانچہ اب خود ہی گر جانے کو ہے۔

۱ مختصر یہ کہ ایسے زمانے میں رام موہن ظہور پذیر ہوئے۔ ایک ایسا سماج جو زمانہ کے جدید اثرات کا مخالف تھا یوروپ کے اس طاقتور چیلنج سے ٹکرایا جو اپنے ساتھ سائنسی علم اور روشن خیالی لیے تھا۔ یہ بات کہ

ہندوستان نے کامیابی کے ساتھ اس چیلنج کا کیسے مقابلہ کیا اس کی بہترین مثال راجہ رام موہن رائے کی زندگی اور اُن کے کارناموں میں پائی جاتی ہے جس نے اپنی ہمہ گیر ذہانت اور قابلیت سے جوابی کارروائی کی ابتدا کی۔

2۔ اوائل عُمری

راجہ موہن رائے ۲۲ مئی ۱۷۷۲ء کو رادھا نگر گاؤں کے ایک متمول برہمن خاندان میں پیدا ہوئے جو اس وقت صوبہ مغربی بنگال کے ہگلی ضلع میں شامل ہے۔ ان کے والد رام کانتو رائے نیز دادا اور پردادا کسی وقت نواب بنگال کے یہاں منشی (سکریٹری) رہے تھے جس کی بدولت انھوں نے کثیر دولت اور جاگیر پیدا کر لی تھی۔ وہ کٹر لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنے تجویز کردہ فرائض کو انجام دینے میں خود کو وقف کر دیا تھا۔ رام موہن کے والد ایک وشنو بھگت تھے یعنی بھگتی مسلک کے پیرو تھے مگر اُن کی والدہ شکتی پوجا (ماں کو قادر مطلق شخصیت تصور کرنا) میں اعتقاد رکھنے والے خاندان سے تھی اس لیے بچپن ہی سے رام موہن ہندوؤں کے دو اہم مسلکوں کا اچھا خاصہ مشاہدہ کیے ہوئے تھے۔ اُس زمانہ میں اعلیٰ ذات

کے چوٹی کے لوگوں میں یہ عام دستور تھا کہ بچپن ہی میں بچوں کی شادی کر دی جاتی اور ایک سے زیادہ شادیاں کی جاتیں۔ رام کانتو بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ ۱۷ سال کی عمر کے قبل خود رام موہن کی تین شادیاں ہوئیں۔ اُن کی ایک بیوی قبل از وقت فوت ہو گئیں باقی دونوں بیویاں عرصہ تک حیات رہیں۔

خدائے واحد کا عقیدہ:

رام کانتو نے اپنے بیٹوں کو عمدہ تعلیم دینے کے سلسلہ میں کبھی اخراجات میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اُن کے تین بیٹے تھے جن میں رام موہن دوسرا بیٹا تھا۔ اُس وقت ایک تعلیم یافتہ ہندو کے لیے تین زبانیں سیکھنا ضروری تھا۔ سب سے پہلے اپنی مادری زبان، پھر سنسکرت جو مذہبی کتابوں کی زبان تصور کی جاتی ہے۔ تیسری فارسی جو اُس وقت عدالت اور حکومت کی زبان تھی۔ موجودہ زمانے کی طرح اُس وقت کوئی اسکول نہ تھے بلکہ ایک بچہ تھوڑی بنگالی سیکھ لیتا اور پھر پڑھنا، لکھنا اور حساب گاؤں کی پاٹھ شالا یا مدرسہ میں پڑھ لیتا۔ رام موہن جیسے ذہین بچے نے جس کی یادداشت نہایت حیرت انگیز تھی بہت ہی جلد نصاب کو پورا کر ڈالا۔ انہیں فارسی پڑھانے کے لیے ایک مولوی مقرر کیا گیا۔ فارسی ادب کا جیسا کہ آپ جانتے ہیں شاعری میں اور بالخصوص عشقِ الٰہی کی شاعری میں ایک بڑا

ذخیرہ ہے۔ عشق کے اس مسلک کو ماننے والے صوفی کہلائے جاتے ہیں جنھوں نے ہندوستان میں اسلامی عقیدے کی ایک اہم شاخ کو تشکیل دی ہے۔ صوفی فلاسفی (فلسفۂ تصوف) ویشنو سے بہت کم ملتا جلتا ہے۔ رام موہن اس شاعری سے بہت متاثر ہوئے۔ اُنھوں نے فارسی ادب کے مطالعہ میں اتنی ترقی کی کہ وہ بارہ سال کی عمر ہی میں مزید مطالعہ کے لیے پٹنہ بھیج دیے گئے۔ یہاں اُنھوں نے عربی زبان بھی سیکھ لی جس میں قرآن پاک تحریر ہے۔ قرآن کے مطالعہ اور اسلامی فلسفہ سے واقفیت کی بنا پر اُن کے مذہبی نقطۂ نظر میں ایک بنیادی تبدیلی رونما ہوئی۔ وہ خدائے واحد کے سچے معتقد بن گئے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہی تمام بڑے مذاہب کی مشترک بنیادی حقیقت ہے۔

تبت کی سیاحت:

رام موہن صرف پندرہ سال کے تھے جب وہ پٹنہ سے فارسی اور عربی کے ماہر ہو کر واپس آئے۔ اُنھوں نے اپنے والد سے مذہبی موضوعات پر متعدد بار طویل بحثیں کیں مگر تلخ مباحثے نہیں کیے۔ اُن کے والد جتنے زیادہ دیندار اور روایت پسند تھے بیٹے اُتنے ہی منطقی اور آزاد خیال (غیر مقلد) تھے اور لوگوں نے جلد ہی دیکھ لیا کہ وہ بنیادی مسائل پر متفق نہ ہو سکے۔ رام موہن رائے دوسرے مذاہب کے بارے میں اور زیادہ

جاننے کی فکر میں ڈوبے رہتے تھے اس لیے تبت میں پھیلے ہوئے بودھ دھرم کے اصولوں کو سیکھنے اور اُن پر بحث کرنے میں تین سال سے زیادہ عرصہ گزارا۔ کچھ لاما لوگ (تبت کے رہنے والے بدھ بھکشو) اُن کے تنقیدی مباحث سے اس قدر ناراض ہوئے کہ کئی بار اُن کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ لیکن کچھ رحمدل خواتین نے اُن کو بچالیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مہربانی نے اُن کو مستورات کا اس درجہ شکرگزار بنا دیا تھا کہ بعد کو اپنی پوری زندگی میں وہ عورتوں کی آزادی کے زبردست حامی بن گئے۔

بنارس اور کلکتہ کا سفر:

تبت سے واپس آکر رام موہن بنارس گئے اور وہاں ہندو مذہب کے فلسفہ کو قریب سے مطالعہ کرنے میں کچھ وقت گزارا کیونکہ یہ شہر زمانۂ قدیم سے علوم سنسکرت اور پرانے ہندوؤں کے اُن مذہبی صحیفوں اور فلسفیانہ تصانیف کا مرکز رہا ہے جو سنسکرت میں لکھی گئی تھیں۔ اُن کے مطالعہ نے اُن کے اس یقین کو اور زیادہ پختہ کر دیا کہ خُدا صرف ایک ہے اور بہت سے دیوی دیوتاؤں اور اُن کی مورتیوں کی پرستش (جنھیں وہ بت کہتے تھے) اور مذہبی رسومات اور سماجی رواج جو اُس کو بنیاد بنائے ہوئے ہیں غلط ہیں اور انسانوں میں غیرضروری تقسیم کا باعث ہیں۔ اُن کے نظریات اُن کے والدین کے نظریات سے اِس قدر مختلف تھے کہ خود

انھوں نے یہ محسوس کرلیا کہ وہ خاندان کے مذہبی رسوم میں شرکت کرنے سے مجبور ہیں۔ اُن دنوں ذات پات کے نظام جیسے ہندوانہ رسوم سے اجتناب و انکار کرنے کا مطلب ہندو مذہب سے انکار تھا۔ اگر ان حالات میں وہ خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے رہتے تو مقامی ہندو سوسائٹی میں دوسرے افراد کو پریشانی میں مبتلا کر دیتے اس لیے وہ خاندانی جائیداد میں حصہ رکھنے کے دعوٰی سے دست بردار ہو گئے۔ وہ کلکتہ تشریف لے گئے اور ایسٹ اِنڈیا کمپنی کے افسران اور تاجران کے لیے ساہوکاری کا کاروبار قائم کرلیا۔ ان کا یہ کاروبار اِتنا کامیاب رہا کہ مختصر سے وقت میں ہی انھوں نے ایک معقول جاگیرانہ ملکیت حاصل کرلی اور شمالی ہند کے مقامات میں متعدد دَورے کئے۔ ۱۸۰۰ء میں وہ ایک انگریز آفیسر جون ڈگبی John Digby کے دوست بن گئے اور اُسی سال اُن کا بڑا بیٹا رادھا پرشاد پیدا ہوا۔ اِس عرصے میں اُنھوں نے انگریزی سے بھی واقفیت حاصل کرلی۔ اس زبان کی مہارت نے آخری سالوں میں مختلف سماجی کام کرنے کے لیے اُنھیں بہت مدد دی۔ یہ زبان اُس وقت بڑھتی ہوئی برطانوی حکومت میں افسران کے استعمال کے لیے فارسی کی جگہ لے رہی تھی اور ہندوستان و مغربی ممالک کے درمیان رابطہ کی زبان بن رہی تھی۔

---

3 - سب سے پہلا چیلنج

رام موہن کے والد ۱۸۰۳ء میں انتقال فرما گئے۔ مذہبی اختلافات کے باوجود رام موہن اپنے والد کا بڑا احترام کرتے تھے۔ جس وقت اُن کے والد بستر مرگ پر تھے وہ فوراً ان کے پاس پہنچے۔ اُس وقت وہ آخری سانس کے ساتھ اپنے خُدا کو پُر جوش عقیدت اور نہایت خلوص کے ساتھ رام رام کہہ کر یاد کر رہے تھے۔ اس عقیدت و خلوص کا لحاظ نہ رکھنا ناممکن تھا۔ اگرچہ رام موہن اُس وقت خاندانی دیوتا کی پرستش کو خیر باد کہہ چکے تھے۔

خدائے واحد کے نظریہ کی حمایت:

اِس وقت تک تو رام موہن اپنے والد کی دل آزاری کے خیال

سے کھُلم کھُلا اپنے نظریات کی اشاعت کرنے سے باز رہے۔ اُن کی وفات کے بعد وہ شہر مُرشد آباد گئے جو اب تک نواب بنگال کا دارالخلافہ تھا۔ وہاں وہ ایک سِول آفیسر تھامس وُڈ فورڈ (THOMAS WOOD FORDE) کے سکریٹری کی حیثیت سے پہنچے اور اپنی سب سے پہلی کتاب شائع کی۔ یہ کتاب فارسی میں تھی جس کا نام 'تحفۃ الموحّدین' (توحید پرستوں کا تحفہ) تھا۔ اس کتاب میں اُنھوں نے بحث کی ہے کہ تمام مذاہب کا صرف وہ حِصّہ عالمگیر ہے جو خدا کی ہستی کا قائل ہے باقی دوسرے حصّے جو ایک دوسرے مذہب کی تردید کرتے ہیں باطل ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ بعد کے یہ دوسرے حصّے پروہت لوگوں کی خود کی تخلیق ہیں تاکہ وہ ایک خاص سوسائٹی میں اپنی طاقت کو استعمال کر سکیں اور برقرار رکھ سکیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مختلف مذاہب کے بہت سے پیشواؤں نے کچھ مخصوص عقائد خالص حقیقت کے رُوپ میں معجزہ یا زورِ بیان سے کام لے کر اور مذہبی طبقہ کے حسبِ حال چالیں چل کر شامل کر دیے ہیں تاکہ وہ اپنا نام زندہ رکھ سکیں اور اپنی نیک نامی کو بڑھا سکیں اور انھوں نے لوگوں کو اس طرح اپنی طرف متوجہ رکھا کہ یہ بے چارے اطاعت اور غلامی کے بندے پورے طور پر اپنے شعور کی آنکھ اور دل کو کھو کر اس بات کو گنہگاری تصوّر کرتے ہیں کہ اپنے پیشواؤں کے احکام کی بجاآوری میں اصل نیکی اور صریح گناہ میں کوئی تمیز

کی جلتے ہاُن کے اِن پیشواؤں کا اثر اپنے معتقدوں پر اور ان کی اطاعت کا حلقہ ان پر اس درجہ غالب ہو چکا ہے کہ کچھ لوگ اپنے پیشواؤں کے اقوال میں پختہ یقین رکھتے ہوئے خیال کرتے ہیں کہ کچھ پتھر، نباتات اور جانور ہی ان کی عبادت کی اصل چیزیں ہیں۔ جو لوگ اُن کی عبادت کی ان چیزوں کو مٹانے یا اُن کی توہین کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اُن کی مخالفت میں وہ دوسروں کی خونریزی یا اپنی زندگی قربان کر دینے کو اس دُنیا کے اندر فخر کی ایک چیز اور اس کے بعد یعنی آخرت میں نجات کا باعث تصوّر کرتے ہیں۔

مذہب میں عقلیت پسندی:

اس کتاب میں رام موہن بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مذہب کی ضرورت انسان کی جبلت میں شامل ہے اِس لیے ہر مذہب سماجی زندگی کو نظم و ضبط میں رکھنے کے لیے کچھ سماجی قوانین مہیا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس دُنیا اور اس کے بعد (آخرت) میں جو سزا یا جزا انسان کو ملتی ہے وہ اس کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ ان قوانین کا منشاء سماج کی فلاح کا تحفظ ہوتا ہے لیکن یہ قوانین اُن قوانین سے جن کو پروہت لوگوں نے اپنے بہبود کی خاطر بنالیا ہے اس طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ مجموعی طور پر اُن سے بھلائی کے بجائے بُرائی زیادہ ہوتی ہے اس بات کی تبلیغ کرکے کہ دوسرے مذاہب کے ماننے والے خدا کے عذاب کے مستحق ہیں ہر مذہب کے پیشوا ایک دوسرے کے

دلوں میں تعصب اور افتراق کے بیج بوکر دائمی برکت سے محروم کر دیتے ہیں جبکہ یہ بالکل عیاں ہے کہ تمام لوگ مختلف مذاہب کے پیرو ہونے کے باوجود زندگی میں بلا امتیاز دنیوی نعمتوں سے برابر کا لطف اٹھاتے ہیں۔ رام موہن اُن پر دہت لوگوں کے کام کو بدظنی کی نظر سے دیکھتے ہیں جو اس فکر میں رہتے ہیں کہ انسانیت کو مردوں اور عورتوں کے مخالف گروہوں میں تقسیم کر کے فائدہ حاصل کیا جائے کیونکہ جس چیز کو ایک قوم سچے مذہب کے لیے رہنمائی کہتی ہے دوسری قوم اُسی کو غلط راہ کے لیے گمراہی قرار دیتی ہے۔ مذہب کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ بلا امتیاز شکل و رنگ، عقیدہ اور مذہب کے تمام ہم جنس مخلوق کے دلوں میں باہمی محبت اور شفقت کے ساتھ اتحاد پیدا ہو اور یہی چیز خالقِ کائنات یعنی خدا کے نزدیک ایک مقبول عبادت ہے۔

رام موہن کی باتیں معقولیت لیے تھیں یعنی مذہبی عقائد کے لیے منطقیانہ تھیں۔ یورپ میں ان کے ہم عصر فلاسفر انھیں خطوط پر بحث کر رہے تھے۔ رام موہن جو ابھی تک کسی یورپی زبان کے اتنے ماہر نہیں ہوئے تھے کہ اُن کا کافی مطالعہ کر سکیں اپنی معقولیت کی بنا پر اُنھیں نتائج پر پہنچے جن پر اہلِ یورپ پہنچے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اوّل خیالات پرواز رکھتے ہیں دوم یہ کہ نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بلکہ عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان

بھی مذہب کے فلسفیانہ اصولوں کو تعصب اور توہم پرستی کی بہت سی ایسی باتوں سے گڈمڈ کر دیا گیا ہے جو معقولیت کی جانچ پڑتال کے سامنے نہیں ٹھہر سکتیں۔ یہ کتاب مذہب کے نام پر کیے گیے تفرقہ پرواز کاموں کے لیے ایک رُوح فرسا حملہ ہے اور بالکل اتنی بے لاگ بھی نہیں جتنی کہ ایک معقول بحث ہونی چاہیئے تاہم ایک لحاظ سے یہ کتاب تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ بالمقابل مذاہب کا سائنٹیفک مطالعہ کے سلسلے میں یہ سب سے پہلا عطیہ ہے۔ اُن کے مغربی فلسفہ اور مذہب کے مطالعہ نے جو ابھی شروع ہی ہوا تھا بہت جلد اُن کے نظریات کو پختگی بخشی اور اُن سے ایک ایسی تحریک کی ابتدا کرائی جس کو اہلِ تاریخ نے ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ' یا نئی بیداری کا نام دیا ہے۔

۴۔ ترقی اور مخالفت

۱۸۰۵ء میں رام موہن نے برطانیہ ایسٹ انڈین کمپنی کی غیر فوجی ملازمت کو اختیار کر لیا اور جون ڈگبی John Digby کے دیوان (چنگی آفیسر) مقرر ہو گئے جو یکے بعد دیگرے ضلع رام گڑھ (واقع صوبہ بہار) جیسور (واقع بنگلہ دیش) بھاگلپور (بہار) اور رنگ پور (واقع بنگلہ دیش) کے رجسٹرار ہوئے۔ رجسٹراروں کا خاص کام اُن زمینداروں (بڑے بڑے جاگیرداروں) کی صحرائی جائیداد کی پیمائش کرنا ہوتا تھا جو ۱۷۹۳ء کے بندوبست استمراری کے نتیجے میں ان جائیدادوں کے مستقل مالک ہو گئے تھے۔ نیز اُن کا کام سرکار کو دی جانے والی رقم سے متعلق مال گزاری تجویز کرنا ہوتا تھا۔ یہ کام مشکل بھی تھا اور نازک بھی۔ برطانوی حکام

نے مقامی زبان اور روایات سے ناواقفیت کی وجہ سے جاگیرداروں کے دعووں اور جواب دعووں کو طے کرنے میں خود کو بالکل نااہل پایا اس لیے وہ مقامی صلاح کاروں اور معاونین کی خدمت لینے کے لیے مجبور رہتے ۔ ڈگبی Digby اس معاملے میں خوش قسمت رہتے کیونکہ رام موہن جیسے صاحبِ علم تجربہ کار اور غیر معمولی ذہانت کے آدمی ان کو مل گئے تھے اور اپنے ساتھ ساتھ کام کے دوران وہ ان کو پیار کرنے اور ان کا احترام کرنے لگے تھے۔

نئے خیالات کی تحصیل:

رام موہن کو روپیہ پیسہ کے لیے تو حقیقت میں نوکری کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ پہلے ہی سے ایک دولت مند زمیندار تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصل منشا انگریز لوگوں کی زبان اور خیالات سے مکمل واقفیت حاصل کرنا اور برطانیہ کی سیاحت کے لیے سامان فراہم کرنا تھا تاکہ وہاں وہ یونیورسٹی میں داخلہ لے سکیں۔ انھوں نے انگریزی کو پڑھا بھی اور بولا اور لکھا بھی اور برطانیہ سے واپس ہونے پر تو انھوں نے انگریزی اخبار کا لگن سے مطالعہ شروع کر دیا۔ فرانسیسی انقلاب کے نتیجے میں فرانسیسی عوام نے جمہوریت قائم کر لی تھی جس کو نپولین بوناپارٹ نے جو تاریخ میں فوج کے عظیم رہنماؤں میں سے تھا شہنشاہیت میں

تبدیل کر دیا۔ رام موہن اُس کی غیر معمولی صلاحیتوں کو بہت سراہا کرتے تھے لیکن جب انھوں نے اُن خیالات کا مطالعہ کیا جو فرانسیسی انقلاب کے محرک تھے یعنی آزادی، مساوات اور اخوت اور اس کے ساتھ برطانوی پارلیمنٹری روایات کی نشو و نما کا بھی مطالعہ کیا تو وہ جمہوریت کے زبردست حامی بن گئے۔ وہ برطانوی لوگ جو شمالی امریکہ میں جاکر آباد ہو گئے تھے اور اُن فرانسیسی لوگوں سے کچھ سال قبل ہی ایک آزاد جمہوریت قائم کر چکے تھے جنھوں نے دنیا کے سامنے ایک ریاست کے اندر شہری حقوق کا سب سے پہلا منشور پیش کیا۔ ڈیڑھ سو سال قبل برطانوی لوگوں نے اپنے جمہوری حقوق کے نفاذ کی خاطر ایک بادشاہ کو قتل کر ڈالا تھا لیکن طنز یہ بات یہ ہے کہ وہ ہی لوگ اپنی نو آبادیات اور غیر ملکی مقبوضات پر مطلق العنان حکومت کر رہے تھے۔ جس قدر رام موہن نے مغربی عوام کی تاریخ اور ترقی کا مطالعہ کیا اسی قدر انھیں اس بات پر اعتماد ہو گیا کہ ہندوستان کی نئی زندگی (نشاۃ ثانیہ) کے لیے برطانوی تعلق سے جو یقینی ہو چکا ہے پورے طور پر ضرور مستفید ہونا چاہیئے۔

حکمران بن جانے پر برطانوی حکام نے مسلم حکمرانوں کے شاندار طریقوں کی نقل کرنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ حکام نے اصرار کیا کہ ہندوستانیوں کو اُن کے سامنے کھڑا رہنا چاہیئے۔ ڈگبی Digby نے جو اپنے دیوان سے

واقف تھا کبھی رام موہن کو کمزار رہنے کی اجازت نہیں دی۔ رام موہن بھی
بڑے خود دار تھے اور وہ کسی شخص کو اپنے ساتھ خود پسندی سے پیش آنے
کی اجازت نہیں دیتے تھے جیسا کہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ظاہر ہوگا:
یہ واقعہ بھاگلپور کے قیام کے دوران پیش آیا۔ سر فریڈریک ہملٹن
Sir Fredrick جو ضلع کے کلکٹر ہو کر حال میں ہی
آئے تھے اُس سڑک سے گزر رہے تھے جس پر رام موہن بھی ایک پالکی
گاڑی میں سوار تھے۔ سر فریڈریک ہملٹن اس بات کی بہت زیادہ اہمیت
سمجھتے تھے کہ جب وہ پیدل جا رہے ہوں تو کسی مقامی ہندوستانی باشندے
کو وہ گھوڑے یا پالکی گاڑی پر سوار ہونے کی اجازت دیں۔ چونکہ رام موہن
گاڑی سے نہیں اُترے اس لیے حاکم نے غضبناک ہو کر ایک تلخ لہجہ میں
اُن کو نیچے اُترنے اور سڑک پر پیدل چلنے کے لیے کہا۔ رام موہن نے
نرمی سے مگر ثابت قدمی کے ساتھ ایسا کرنے سے اِنکار کر دیا اور جب
اُس کی حجتیں ناکام ہو گئیں تو رام موہن اپنی پالکی گاڑی میں سوار ہو کر
خاموشی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ بعد کو انھوں نے اِس معاملے کو اُس
آفیسر کے نامہذب برتاؤ کی شکایت کرتے ہوئے گورنر جنرل لارڈ منٹو کے
سامنے رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سر فریڈریک (Sir Frederick کو ملامت
کی گئی۔

مذاہب پر مباحثے:

رنگ پور میں جب رام موہن ڈگبی (DIGBY) کے ساتھ قریب ۵ سال تک رہے تو وہ متواتر شام کو اپنے دوستوں کے ساتھ مذہبی معاملوں پر اور خصوصاً بت پرستی پر مباحثے کرتے جس کو وہ اپنی منطق سے مہمل اور خلافِ عقل ٹھہراتے ۔ اُس زمانے میں رنگ پور، آسام، بنگال اور بہار کے شمالی علاقوں کا صدر مقام تھا اور تعلیم یافتہ ہندوؤں، مسلمانوں کے علاوہ راجستھان کے علاقہ میواڑ سے آنے والے کچھ جینی باشندے بھی مباحثوں میں شرکت کرتے تھے۔ جینی لوگوں کے مباحثوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انھوں نے جینیوں کی متبرک کتاب خصوصاً کلپاسوترا Kalpa SUTRA کا مطالعہ کیا اور اس طرح انھوں نے اپنی علمیت کے اسلحہ خانہ میں ایک اور ہتھیار کا اضافہ کرلیا۔

کچھ ہندو پنڈتوں نے روایت پرستی کے تحفظ کی خاطر رام موہن کے خلاف لاٹھیاں اٹھالیں۔ رام موہن کے لیے مذہبی لٹریچر کی عمدہ معلومات اور منطقیانہ زور کی بنا پر اُن کو مباحثوں میں شکست دے دینا کچھ بھی مشکل نہ تھا لیکن روایت پرست اپنے انتقامی عناد کے ساتھ اُن کے پیچھے پڑ گئے۔ اُن میں سے کچھ نے اُن کے کردار کو بدنام کرنے کی کوشش کی لیکن یہ خود اُن کا خاندان اور بالخصوص اُن کی والدہ تھیں جنھوں نے فیڈرل کورٹ (عدالت عالیہ) میں اُن کی اپنی کوششوں سے حاصل کردہ جاگیر میں

ملکیت کا دعویٰ دائر کرکے انھیں مالی حیثیت سے تباہ کرنے کی کوشش کی۔
۱۸۰۳ء میں ان کے والد کے انتقال پر خاندانی جاگیر اُن کے بڑے بھائی
جگموہن کے نام منتقل ہو گئی۔ جگموہن خود ۱۸۱۲ء میں انتقال کر گئے تو اُن
کا بیٹا گوبند پرشاد جانشین ٹھہرایا گیا جو مقدمہ میں مدعی کی حیثیت سے پیش
ہوا۔ طویل سماعت کے بعد مقدمہ مع خرچہ خارج ہو گیا۔ جگموہن کی پسماندہ
بیوہ نے ایک دوسرا مقدمہ دائر کر دیا۔ اس کے بعد بردوان کے راجہ نے
بھی ایک مقدمہ دائر کر دیا جس نے اُس کے بیٹے رادھا پرشاد کے خلاف بھی
دوسرا مقدمہ دائر کرا دیا۔ یہ تمام مقدمات قطعی طور پر ناکام رہے لیکن ۱۸۲۶ء
تک یہ متواتر پریشانی کا باعث بنے رہے اور ان سے اُن کی تندرستی پر کافی
خراب اثر پڑا۔ دو مشہور محققوں نے کہا ہے کہ "یہ مقدمات راجہ (رام موہن)
کی طویل اذیت رسانی کے واقعات ہیں اور یہی اُس انسان کی حُبّ الوطنی
اور عظمت کو نمایاں کرتے ہیں جس نے تباہی اور بدنامی کے حملوں کے باوجود
اپنے ہموطنوں کی اصلاح و ترقی کے خود عائد کردہ مقصد کو نظر سے اوجھل
نہ ہونے دیا۔"

سب سے پہلا کامیاب سفارشی مشن :

رنگ پور کے قیام کے دوران رام موہن کو پہلی بار ایک
سفارتی مشن پر بھیجا گیا۔ کوچ بہار کا اصلی شہزادہ جس نے انگریزوں کے

اقتدار کو تسلیم کرلیا تھا۔ بھوٹان کے راجہ سے سرحد کے بارے میں ایک جھگڑا رکھتا تھا۔ رام موہن کو جھگڑا طے کرنے اور مصالحت کرانے کے لیے ایک دوسرے ہندوستانی آفیسر کے ساتھ بھیجا گیا۔ مشن اتنا کامیاب رہا کہ دونوں پارٹیوں اور گورنمنٹ کو پورا پورا اطمینان ہوگیا۔

ستی کا خاتمہ :

ایک دوسرا واقعہ جو اس عرصہ میں پیش آیا اُس نے تو اُن کی زندگی پر ایک گہرا نقش چھوڑا ہے۔ جب جگموہن کا انتقال ہوگیا تو اُن کی بڑی بیوی نے اپنے شوہر کی چتا میں جل کر ستی کی رسم ادا کی۔ اُن کی سوانح نگار مس کالٹ Miss Collet لکھتی ہیں کہ "کہا جاتا ہے کہ رام موہن نے پہلے اُس کو اِس بھیانک اقدام سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن ناکام رہے مگر جب اُس نے آگ کی لپٹوں کو محسوس کیا تو اُس نے چتا سے اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اُس کے روایت پرست رشتہ داروں اور پروہت لوگوں نے اُس کو بانس کے ڈنڈوں کی مدد سے وہیں رہنے اور مر جانے پر مجبور کر دیا اور اُس کی چیخ و پکار کو دبانے کے لیے زور شور سے ڈھول اور پیتل کے تھالوں کو بجایا گیا۔ رام موہن اُس کو بچانے کے لیے ناکام رہے اور اُنھوں نے ناقابل اظہار غصہ اور رحم بھر کر فوراً وہیں پر اپنے دل میں قسم کھائی کہ مَیں اُس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھوں گا جب

تک کہ اس خبیث رسم کو جڑ سے نہ اُکھاڑ پھینکوں"۔

مس کالٹ Miss Collet مزید لکھتی ہیں کہ "اُنھوں نے اپنی قسم کو پورا کیا۔ پُورے ۱۹ سال گزرنے سے پہلے ہی یہ قسم گورنمنٹ کے حکم 'خاتمہ ستی' کے ذریعے ۴ر دسمبر ۱۸۲۹ء کو پوری ہوگئی"۔

واضح ہو کہ ستی کی رسم ہندؤوں میں وسیع پیمانے پر نہیں منائی جاتی تھی۔ اس کا تعلق صرف اعلیٰ ذات کے لوگوں تک محدود تھا۔ اس کام کو کٹر روایات کی رُو سے ایک اعلیٰ مذہبی اعزاز سمجھا جاتا تھا اور جیسا کہ اس معاملہ میں ہُوا۔ بیواؤں کو بعض اوقات اُن کے شوہروں کی چتاؤں پر زبردستی جلا دیا جاتا تھا۔ اس بات کو صحیح ماننے کی ایک دلیل ہے کہ بہت سے معاملات میں یہی ہوا کرتا تھا۔ بعض اوقات بیوائیں ہندو بیوہ عورت کی بدنصیب زندگی پر جلدی اور ثواب کی موت کو ترجیح دیتی تھیں لیکن خواہ یہ رضاکارانہ تھی یا جبراً ستی کی رسم وقت کے ہندو سماج کی وحشیانہ رسُومات میں سے تھی۔ یہ کسی بھی زمانہ اور کسی بھی سماج کی سب سے ظالمانہ رسُومات میں سے ایک ہے۔ خود انسانیت کا تقاضہ تھا کہ اس کو ختم ہو جانا چاہیئے۔ رام موہن کی جدوجہد کی کامیابی کی بدولت اُن کی زندگی میں اور ان کی موت کے بعد سے اب تک سماجی اصلاحوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔

وراثت کے ہندو قانون کی تشریح :

اس سلسلہ میں رام موہن کی اہم کتاب جو ۱۸۲۲ء میں "وراثت کے ہندو قانون کے مطابق عورتوں کے قدیم حقوق پر جدید غاصبانہ قبضہ"

"Modern encroachments on the ancient rights of females to the Hindu Laws of Inheritance

کے نام سے شائع ہوئی قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے ہندوؤں کی مستند متبرک کتابوں کے حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ تمام قدیم با اقتدار لوگوں کا یہ متفقہ فیصلہ رہا ہے کہ "ایک ماں کے لیے اس کے بیٹے کے ساتھ اس کے متوفی شوہر کی متروکہ جائیداد میں برابر کا حصہ ہے" تاکہ وہ اپنے باقیماندہ دنوں کو اپنے بچوں سے آزاد رہ کر گزار سکے لیکن بعد کو یہ قانون اس انداز سے بدل دیا گیا کہ "بیوائیں اپنے شوہروں کی جائیداد کی تقسیم پر مفلس بن کر رہ گئیں"۔ اس طرح وہ اپنے شوہروں کی موت کے فوراً بعد اپنے بیٹوں کے دستِ نگر ہو گئیں۔ ان کے سامنے صرف تین بدل تھے : کسی دوسرے شوہر کے ملنے سے مایوس ہو کر غلاموں کی طرح دوسروں کے سہارے زندگی گزارنا یا غیر اخلاقی کردار اختیار کر کے آزادانہ بسر کرنا یا موت کے بعد کی زندگی میں ثواب پانے کے لیے اپنے شوہروں کی چتاؤں پر جان دے دینا۔ انھوں نے واضح کیا کہ کثرت ازدواج کی رسم نے کس طرح بیواؤں،

وراثت کے قدیم قانون کو مُشکل بنا دیا تھا۔" برہمنوں میں کثرت ازدواج کی یہ بھیانک رسم براہِ راست قدیم بانیوں کے ذریعے دیے گئے قانون کے بالکل برعکس ہے" جن کا کہنا تھا کہ پہلی بیوی کی زندگی میں دوسری شادی اسی وقت جائز ہے جب کہ پہلی بیوی میں کوئی جسمانی یا اخلاقی عیب پیدا ہو جائے۔

رام موہن نے یہ بھی بتلایا کہ قدیم ہندو قانون میں لڑکی کو متوفی باپ کی جائیداد میں چوتھائی حصہ دیا گیا تھا لیکن موجودہ رواج کے تحت لڑکی کو بیٹے کی موجودگی میں نہ صرف اُس کے حق سے محرُوم کر دیا گیا بلکہ خاندانی سرمایہ کو بڑھانے کے لیے اکثر اس کو شادی میں بیچ دیا جاتا تھا۔ اس رسالہ سے اور دوسرے معتبر ذرائع سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رام موہن نے بیواؤں کی دوبارہ شادی کرنے اور ایک وقت میں ایک ہی بیوی رکھنے نیز جائیداد میں بیواؤں اور لڑکیوں کا حق جانشینی مقرر کرنے کی بڑی حمایت کی ہے۔ اس معاملہ میں وہ سماجی حلقہ میں مساوی حقوق کی اشاعت کر رہے تھے جن کی وکالت انھوں نے سیاسی حلقہ میں کی تھی۔ بعد میں بیواؤں کی دوسری شادی کی تحریک ایشور چندر ودیا ساگر نے شروع کی اور ۱۸۵۶ء میں ایک قانون بن گیا جس میں دوبارہ شادی کی اجازت دے دی گئی۔

5 ۔ گھمسان لڑائی

اس تمام زمانے میں ہندوستانی سماج کی اصلاح کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے رام موہن کو اور زیادہ لگن ہوئی وہ مذہب کو توہم پرستی اور غیر معقول عقائد سے پاک کرنا اور سماج کو بُرے رسم و رواج اور جہالت سے صاف کرنا چاہتے تھے اور آزادی، مساوات اور اخوت کی بنیاد پر سیاسی حیثیت سے ہندوستانی قومیت کے شعور کو تعلیم یافتہ اشخاص کے دماغوں میں پیدا کرنا اور ترقی دینا چاہتے تھے۔ اس لیے ۱۸۱۵ء میں اُنھوں نے سرکاری ملازمت کو ترک کر دیا اور کلکتہ میں مستقل رہائش اختیار کر لی جو مشرق میں انگریزی حکومت کا دارالخلافہ اور ہندوستان میں مغربی تہذیب کا مرکز بن گیا تھا اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے برطانوی حکام

عیسائی تھے مگر کمپنی مذہب میں کوئی دلچسپی نہ رکھتی تھی۔ وہ تجارت کرنے کی
غرض سے آئے تھے لیکن حکومت کرنے کے لیے ٹھہر گئے لیکن اس کے تھوڑے
عرصے بعد ہی عیسائیوں کی تبلیغی جماعتیں برطانیہ سے آنا شروع ہوگئیں
جو ہندوستانی ملحدوں کو عیسائیت میں تبدیل کرکے ان کی رُوحوں کو نجات
دینے کے لیے پُرجوش تھے۔ یہ تبلیغی جماعتیں انگلینڈ کی گرجا گھر سے تعلق رکھتی
تھیں جن کا رشتہ پروٹسٹنٹ (احتجاج کنندہ) فرقہ سے تھا جس کو برطانوی
سرکار نے ریاستی مذہب کی حیثیت سے منظور کر رکھا تھا۔ وہ اپنے ساتھ
چھاپہ خانے لائے اور بنگالی ٹائپ کی ایجاد کی۔ اپنے عقائد کی توضیح اور
ہندو مذہب پر تنقید کی۔ نیز لوگوں کو اُن کے رسم و رواج اور طور طریقوں پر
ملامت کرتے ہوئے انھوں نے کتابیں اور رسالے شائع کیے۔ ہندو سماج
کے روایت پسند رہنماؤں کو فاتح طبقہ کے مذہب کا اس طرح تھوپا جانا
زمانہ قدیم کے مسلمانوں کی تبلیغ سے زیادہ بدتر نظر آیا کیونکہ انگریز لوگ بالکل
مختلف اور طاقتور کلچر، صنعتی طاقت اور کسی قدر خیال کی آزادی اپنے ساتھ
لائے تھے لیکن عیسائیت کی تبلیغی جماعتوں نے ہندوستانیوں کو معقولیت
اور اخلاقی تحریص سے عیسائی بنانا چاہا۔ بعض اوقات بلاشبہ انھیں بہتر
معیشت کا لالچ دیا جاتا۔ اُن کی ترغیبات اُن کی تبلیغ کے لیے بدقسمتی سے
مُضر ثابت ہوئیں کیونکہ انھوں نے ہندوؤں کے عزیز عقائد اور صریحی گندے

رسومات کی شدید طریقے سے بُرائی کرنے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ حملے بڑے ناگوار گزرے کیونکہ ہندؤں نے خیال کیا کہ اُن کے مذہب پر جو تنقید کی گئی ہے وہ لاعلمی کی بنا پر ہے (جو اپنی جگہ صحیح تھا) اور اس کی پشت پر ایک بڑا مقصد پنہاں ہے (جو صحیح نہیں تھا)۔ کلکتہ کے متمول ہندو لوگ روایت پرستی کی مدافعت میں پیش پیش تھے۔ اُنھوں نے تعلیم یافتہ ہندؤں کی جماعت کو اپنے زمانے کی ہندویت کو زوردار طور پر چلانے کے لیے منظم کیا اور اس کے لیے سرمایہ لگایا۔

ہندویت کے لیے ایک استدلالی بنیاد :

رام موہن رائے کو ایک طرف تو عیسائیت کی اُن تبلیغی جماعتوں نے مصیبت میں ڈال دیا جو ہندویت کو مفلوج کرنا چاہتی تھیں اور دوسری طرف اُن روایت پسند ہندؤں نے جو ہندویت کے جسم پر سے کسی بھی متبرک زنگ آلود نشان کو مٹنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود رام موہن نے ہندؤں اور غیر ملکیوں دونوں کو ہندو مذہب کی اصلی بنیادوں کو بتلانے کا پختہ ارادہ کیا لیکن قدامت پرست ہندو یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ حقیقت میں ہندو مذہب کو ایک استدلالی بنیاد دینا چاہتے ہیں اور مغربی دُنیا کی نظر میں ہندوستان کی عظمت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ وہ دائمی مخالفت کے باوجود اپنے دونوں مقاصد میں کامیاب رہے۔ اُن کے

اس دوسرے منصوبے کو عمل میں لانے کے لیے زیادہ وقت لگا کیونکہ بنیادی سماجی اصلاحات اور تدابیر کے ذریعے ہندوستان کی ذہنی وراثت کو چھوڑے بغیر ہندوستانیوں کو ایک قومی حیثیت دے کر خیال اور زندگی کے جدید طریقوں کی طرف لایا جائے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے اس عمل کو شروع کر دیا تھا۔

ویدانت۔ہندو عقیدہ :

اپنے ہم عصر متمول لوگوں کی طرح رام موہن نے اپنے لیے شہر میں ایک شہری مکان اور نواح میں پائیں باغ تعمیر کرایا جو بعد کو ان کی پسندیدہ رہائش گاہ بن گئی۔ انھوں نے ایک دولت مند زمیندار کی طرز معاشرت کو اختیار کر لیا اور بہت ہی مختصر سے عرصہ میں وہ ایک نمایاں شہری کی حیثیت سے جاگزیں ہو گئے اور ہندوستانی نیز یوروپی حلقوں میں اُن کا استقبال کیا جانے لگا۔ انھوں نے اپنی زود فہمی سے یہ محسوس کر لیا کہ عیسائیت کے حملے سے ہندو مذہب کو اتنا خطرہ لاحق نہیں جتنا کہ خود اس کی توہم پرستی اور تعصب کی گندگی اور اس عظیم روحانی ترکہ کو وسیع جہالت سے ہے جو ہندو مذہب کی بنیاد کو تشکیل دیتی ہے۔ اُن کی نظر میں بہت سے دیوتاؤں کا رائج الوقت عقیدہ اور اُن دیوتاؤں کی مورتیوں کی پوجا اور اُن میں سے کسی ایک یا ایک سے زائد کے بارے میں اقتدار اعلیٰ ہستی یا ہستیوں کا تصور کرنا اصل بُرائی تھی

جو ہندو سماج میں آگئی تھی اور قدیم عقیدہ اور عمل کی زبردست خرابی تھی اِس لیے اُنھوں نے ہندو دھرم کی قدیم مذہبی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا اور معلوم کیا کہ ویدانت (جس کے ادبی معنی ویدوں کا اختتام یعنی ویدوں کا جوہر ہے) ہندو عقیدہ کا سرچشمہ ہے ۔ یہ سنسکرت میں اُپ نشدوں اور اُن تبصروں پر مشتمل ہے جو شنکر آچاریہ جیسے فلاسفروں اور دوسرے لوگوں نے کیے ہیں۔ اب روایت پرست علماء نے ایک مدّت سے فلسفہ کے اس جوہر کے مطالعہ سے لاپرواہی برت رکھی تھی اور جو ایک اچھے ہندو کی نشانی کے لیے صرف چال چلن کے اصولوں اور رسم ورواج کی پابندی پر خاص کر زور دے رہے تھے ۔ کلکتہ میں رہائش اختیار کرنے کے فوراً بعد رام موہن نے قدیم رسالہ ویدانت سرا (ویدانت کے اصولوں) کا بنگالی زبان میں ترجمہ کیا اور ایک سال بعد اس کا مختصر ترجمہ بنگالی، ہندوستانی اور انگریزی میں کیا ۔ یہ تمام کتابیں اُنھوں نے مفت تقسیم کرائیں جیسا کہ عیسائیت کی تبلیغی جماعتوں نے اپنے رسالے مفت تقسیم کرائے تھے ۔

مذہبی کتابوں کی صحیح ترجمانی :

ویدانت کی تعلیم کیا ہے ؟ بہت مختصر الفاظ میں اس کی تعلیم یہ ہے کہ ایک سب سے بڑی ہستی ہے جس کے اندر ہر چیز موجود ہے ۔ یہ ہستی ہر چیز میں ہے لیکن یہ ہر چیز سے اور تمام چیزوں کے مجموعہ سے کہیں وسیع تر ہے اِس

لیے کوئی خاص شکل یا مُورتی اس ہستی کو ظاہر نہیں کر سکتی جو نہ خوبصورت ہے اور نہ ہی بدصُورت' اور نہ انسان ہے نہ ہی فوق البشر' نہ ناپائیدار ہے نہ غیر فانی بلکہ یہ سب کچھ ہے۔ یہ ہستی ہمیشہ رہنے والی ہے اِس لیے وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہو سکتی جس کی ابتدا اور انتہا ہو اور نہ ہی وہ انسانی حواس سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہ ہی ہستی کائنات کی تمام مخلوق کو جس میں ہماری زمین بھی شامل ہے زندہ اور ضابطہ کے ساتھ قائم رکھے ہوئے ہے۔ اور ان تمام اجرام کو بھی جو اس لامحدود فضائے بسیط میں موجود ہیں نیز ذرہ کے تقسیم در تقسیم کیے گئے سب سے چھوٹے اجزاء اور زندگی کی سب سے چھوٹی شکلوں جیسے جراثیم اور سمی مادہ کو قائم اور منضبط کیے ہوئے ہے۔ خدا صرف ایک ہے اور کوئی اس کے برابر نہیں۔ اس کی ذات میں تمام عالم و مافیہا سمائے ہوئے ہیں۔ لہذا وہ شخص جو اپنے دماغ سے تمام اشیاء کے اندر اُس بالاتر رُوح کو دیکھتا ہے کامل اطمینان حاصل کر لیتا ہے اور اُس قادرِ مطلق ہستی میں ڈوب جاتا ہے۔ اِس لیے جب کوئی شخص کسی مخلوق' شے یا مُورتی کی پُوجا کرتا ہے تو وہ گویا اس بالاتر ہستی کے ایک جُزکی پُوجا کرتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے مذہبی رسوم اور قربانیوں کی پیش کش وغیرہ کوئی روحانی قدر و قیمت نہیں رکھتی ہیں۔ سچی عبادت' تزکیۂ نفس' خود یافتگی اور دوسروں کی خدمت نیز حقیقی علم کی جستجو میں مضمر ہے۔ اس طرح ویدانت کا ایک سچا پیرو

دوسرے مذاہب یا بہت سے دیوتاؤں اور مورتیوں کے پُوجاریوں سے
کوئی اختلاف بجز اس کے نہیں رکھتا کہ ان کا نقطہ نظر محدود ہوتا ہے اور
اس لیے صحیح نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی روحانی جستجو انھیں اس بالاتر ہستی
کے حصول کی طرف لے جا سکتی ہے۔

علم جدید اور قومی اتحاد:

چونکہ تمام انسان خدا کو برابر حیثیت سے مانتے ہیں اس لیے وہ
خدا کے نزدیک برابر ہیں اور اسی لیے سماجی زندگی میں بھی برابر کا حق رکھتے
ہیں۔ منطقی طور پر ان کے اس حق کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نقطہ نظر سے
ہندوؤں میں ذات پات کی تفریق اور اس سے ظہور میں آنے والے تمام
رواج جنھوں نے لوگوں کو پیدائش کی بنیاد پر اعلیٰ اور ادنیٰ گروہوں میں تقسیم
کر دیا ہے نہ صرف مذموم ہیں بلکہ خدا کی تکذیب میں شامل ہیں۔ رام موہن کو
یقین تھا کہ اگر ہندو سماج ویدانت کی تعلیم کی روشنی میں اپنی اصلاح کر لے
تو وہ نہ صرف مختلف فرقوں کو وحدت میں پرو دے گا بلکہ سماجی زندگی کے
مقاصد کے لیے تمام فرقوں کے افراد کے لیے ایک مشترک جلسہ گاہ بن جائے گا
اور ہندوستانی عوام کی وسیع تر جماعت ایک قوم میں منتقل ہو جائے گی۔
تاریخ عالم کے مطالعہ نے انھیں آزادی اور جمہوریت کا زبردست حامی بنا
دیا تھا مگر انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ آزاد ہونے کے لیے ہندوستانیوں

کو سب سے پہلے ایک قوم ہونا چاہیئے اور ساتھ ہی علم جدید میں جو قومی اتحاد میں بڑا معاون ہوتا ہے دسترس حاصل کر کے طاقتور بننا چاہیئے۔

یہ کہنا تو فضول ہی ہے کہ ان کے نظریات نے ہندؤں کے روشن خیال طبقہ میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا تھا اور مخالفانہ تنقید کو اپنی طرف بہت زیادہ متوجہ کر لیا تھا لیکن انھوں نے اُن صاحبِ فکر کی ایک جماعت کو بھی متوجہ کیا جو ہندو فلاسفی میں دلچسپی رکھتے تھے اور سماجی بہبُود کے لیے فکرمند تھے، ان میں دوارکا ناتھ ٹیگور جو سوداگروں کے شہزادہ اور رابندرناتھ ٹیگور کے دادا تھے نیز شہر کی کچھ دیگر قابلِ ذکر ہستیاں تھیں۔ ان دوستوں سے مل کر اُنھوں نے ایک مختصر سا گروپ بنایا جس کا نام آتم سبھا (روحانی انجمن) رکھا۔ اس گروپ میں ایک عالم سنیاسی ہری ہرنند سوامی اور ایک انسان دوست انگریز ڈیوڈ ہیر (David Hare) تھے۔ اتفاق سے ڈیوڈ ہیر ہی کچھ عرصہ بعد کلکتہ میں ہندوستانیوں کے لیے سب سے پہلے انگریزی اسکول کے بانی ہوئے۔ یہ تاریخی اسکول ابھی تک اُن کے نام سے موسوم ہے۔

ہیر کا اسکول (Hare's School) : رام موہن کا نام کلکتہ کے قدامت پسند حضرات میں کس قدر قابلِ نفرت ہو گیا تھا۔ یہ بات ذیل کے اس واقعہ سے واضح ہو جائے گی۔ ہیر (HARE) کے اسکول کے قیام کے سلسلہ میں پیش آیا۔ رام موہن ہیر کے ساتھ اسکیم پر عمل پیرا تھے جس کی نظر نے اس

وقت کلکتہ کے چیف جسٹس نے مقامی معروف لوگوں سے حمایت کرنے کی اپیل کی۔ کچھ معروف اصحاب نے چیف جسٹس سے کہاکہ وہ اسکول کو اپنا مالی تعاون اس وقت دے سکیں گے۔ جب کہ رام موہن اس سے اپنا کوئی تعلق نہ رکھیں۔ ذاتی شہرت کے مقابلے میں اس کام کو ترجیح دیتے ہوئے رام موہن نے علی الاعلان اپنا نام سرپرستوں کی فہرست سے واپس لے لیا اور اسکول تھوڑے عرصے بعد ہی قائم ہوگیا۔

سماجی بُرائیوں کا ازالہ:

سماجی بُرائیوں میں سب سے پہلی برائی جس کو رام موہن نے دُور کرنے کا تہیہ کرلیا تھا ستی کی رسم تھی جس کی طرف ابتدا میں اشارہ کیا جاچکا ہے۔ برطانوی حکام جو ہندؤوں کے ساتھ کسی تصادم سے دُور رہنا چاہتے تھے۔ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ اس رسم کو روک دینے کے لیے کوئی تحریک چلائیں اگرچہ ان کی نظر میں یہ ایک بھیانک چیز تھی ۔ وہ ہندؤوں کی مذہبی کتابوں کے بارے میں کوئی علم نہ رکھتے تھے اور پنڈتوں نے رائے لیے جانے پر انھیں مشورہ دیا تھا کہ یہ رسم کچھ شرطوں کے ساتھ مذہبی تصدیق کی حامل ہے۔ جس وقت حکومت ستی کی مخالفت کے بارے میں پس و پیش میں تھی تو معزز شہریوں کی ایک بڑی تعداد نے گورنر جنرل کو یہ درخواست کرتے ہوئے ایک عرضداشت بھیجی کہ حکومت کے ذریعے ستی کے

خلاف سخت کارروائی کی جانی چاہیئے۔

میدان عمل کی یہ وہ منزل تھی جس میں رام موہن نے قدم رکھا تھا بلاشبہ انھوں نے ہی اس عرضداشت میں بڑے پیمانے پر روح پھونکی تھی لیکن انھوں نے طے کیا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ جب انھیں پیش قدمی کرنی چاہیئے۔ اپنی عرضداشت میں حکومت کے سامنے انھوں نے روایت پسندوں کے اس مباحثہ کو مسمار کر دیا کہ عورتیں کردار کی کمزور ہوتی ہیں اور جلد ہی لالچ کا شکار ہو جاتی ہیں اور یہ کہ اگر بیواؤں کو زندہ رہنے کی اجازت دے دی گئی تو ان کو غیر اخلاقی زندگی بسر کرنے پر پھسلایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بتلایا کہ بہت سی بیواؤں نے بے داغ اور پاک زندگی بسر کی ہے اور یہ کہ جب رنڈووں کو دوبارہ شادی کرنے اور زندگی کی تمام خوشیوں سے لطف اندوز ہونے کی آزادی دی جاتی ہے تو بیواؤں کو اس قسم کی آزادی کیوں نہ دی جائے اور انھیں تلخ زندگی گزارنے اور بہت سے معاملات میں غلامی کی زندگی بسر کرنے پر کیوں مجبور کیا جائے ۔ انھوں نے بتلایا کہ ہندو قانون اور دستور کی زیادہ تر مستند کتابیں نہ تو بیوہ کو شوہر کی چتا پر خودکشی کرنے کی ہدایت دیتی ہیں اور نہ ہی اس کی حمایت کرتی ہیں۔

۱۸۱۸ء سے ۱۸۲۸ء تک یہ بحث دس سال تک زوروں پر جاری رہی، حکومت کشمکش و پیچ میں رہی یہاں تک کہ بعد کے سالوں میں لارڈ ولیم

بینٹنک گورنر جنرل کی حیثیت سے تشریف لائے۔ انھوں نے رام موہن سے مشورہ کیا۔ رام موہن نے سخت قانون سازی کے زور پر سماجی اصلاح کو عمل میں لانے کی مخالفت کی اور مشورہ دیا کہ "اس رواج کو مشکلات پیدا کر کے اور پولیس کے وسیلہ سے خاموشی کے ساتھ عوام کی نظر سے بچا کر دبایا جا سکتا ہے"۔ سرکاری یادداشت میں بتلایا گیا ہے کہ رام موہن کو یہ خوف تھا کہ عوام کے لیے ایسا قانون بنا دینے سے امن کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اور انگریزوں کی نیت کے خلاف بدگمانی پھیل سکتی ہے اور لوگ خیال کر سکتے ہیں کہ ستی پر مکمل پابندی غیر ملکی حکمرانی کے ذریعہ غلام رعایا کے مذہب میں دخل اندازی کی ایک کارروائی ہے۔ رام موہن پورے یقین کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے کہ سماجی اصلاحات کا شوق خود عوام ہی کی طرف سے ظاہر ہونا چاہیئے اور یہ کہ یہ شوق لوگوں میں تعلیم ہی کے ذریعے بیدار کیا جا سکتا ہے۔ رام موہن کے اندیشے بادی النظر میں صحیح دکھائی دیتے تھے۔ کچھ مشہور مورخین خیال کرتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں یہ قانون لوگوں کے مذہبی رواج میں ایک ناجائز مداخلت کی مثال میں پیش کیا گیا تھا۔

مگر سرکار نے قانون کے ذریعے ستی کی رسم کو ختم کرنے کے لیے خود کو کافی مضبوط محسوس کیا۔ رام موہن کے مقصد کے لیے یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس رسم کے خاتمہ کے لیے رام موہن

کی مسلسل جد و جہد کے ذریعے عوام کی بڑی حمایت نے سرکار کے کوئی فیصلہ نہ دینے کی صورت میں قطعی کامیابی پالی تھی۔ ایک تبلیغی جماعت کے سرکردہ لیڈر نے لارڈ بینٹنک سے رام موہن کی سب سے پہلی ملاقات کے بارے میں ایک دلچسپ قصّہ سنایا ہے۔ گورنر جنرل نے رام موہن کے پاس ایک ایڈی کانگ (AIDE- CANG) کو بھیجتے ہوئے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر انھوں نے جواب دیا تھا: "میں نے اب تمام دنیوی مشاغل سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے اور مذہبی کلچر میں معروف ہوں اور حق کا متلاشی ہوں۔ مہربانی کرکے گورنر جنرل سے میرا آداب کہہ دیجیے اور بتلا دیجیے کہ آپ کے بلند پایہ حضور حاضر ہونے کا میرا کوئی رجحان نہیں ہے اور اس لیے میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ براہِ کرم مجھے معاف فرمائیں گے"۔ گورنر جنرل نے یہ خبر سُن کر پوچھا کہ "تم نے رام موہن سے کیا کہا تھا؟" ایڈی کانگ نے جواب دیا کہ "میں نے اُن سے کہا تھا کہ گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک آپ سے ملنے کے آرزومند ہیں"۔ گورنر جنرل نے کہا کہ "پھر جا کر اُن سے کہو کہ ولیم بینٹنک آپ کے بہت شکرگزار ہوں گے اگر ایک بار آپ ان سے ملاقات فرما سکیں"۔ رام موہن اس کے بعد ایسی شریفانہ التجا پر انکار نہ کر سکے۔

یہ تھا وہ خمیر جس سے وہ انسان بنا تھا۔

6 - نئے معرکے

اُسی زمانہ میں جب کہ وہ ستی اور ہندو مذہب کی بداطواری کے خلاف جدو جہد کر رہے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے ایک طاقت ور ہندو قدامت پرستی کا مقابلہ کیا رام موہن ایک دوسرے محاذ پر بھی منہمک تھے ۔ وہ عیسائیوں کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کر رہے تھے لیکن وہ بائبل کے پُرانے اور نئے عہدناموں کے اِنگلش ترجمے سے مطمئن نہ تھے اِس لیے انھوں نے اُن عبرانی اور یونانی زبانوں کو سیکھا جن میں یہ دونوں عہدنامے بالترتیب لکھے گئے ہیں ۔ ایک بار انھوں نے نئے عہدنامے کے عیشائے ربانی (وہ حصّہ جو عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زندگی اور ان کی تعلیمات سے متعلق ہے) کا بنگالی میں ترجمہ کرنے میں برطانوی تبلیغی جماعتوں کی مذہبی کی تھی ۔ انھوں نے ۱۸۱۷ء میں جان ڈگبی (John Digby) کو لکھا

تھا کہ "مذہبی حقائق میں میری طویل اور مسلسل تحقیقات کا ماحصل یہ ہے کہ
میں نے عیسیٰ مسیح کی تعلیمات کو ان دوسری تعلیمات کے مقابلہ میں جو میرے
علم میں آتی ہیں اخلاقی اصولوں کے لحاظ سے کہیں زیادہ مددگار اور ذی عقل
لوگوں کے استعمال کے لیے زیادہ موزوں پایا ہے"۔ سنہ ۱۸۲۰ء میں انھوں
نے چار عشائے ربانی میں سے عیسیٰ مسیح کی اخلاقی اور مذہبی تعلیمات کے
انتخاب کو (The Precepts of Jesus) (عیسیٰ مسیح کے اقوال) کے
نام سے شائع کیا وہ ان معجزات میں یقین رکھتے تھے جنھیں عیسیٰ مسیح کے
نام سے منسوب کیا جاتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ "ایشیا کے باشندوں سے ہم
تک پہنچنے والی خود ساختہ کہانیاں ان کہانیوں کے مقابلے میں زیادہ تعجب خیز
ہیں"۔ خدائے واحد میں پختہ یقین رکھنے کی وجہ سے انھوں نے یہ بھی اعلان
کیا کہ وہ تثلیث باپ (خدا) بیٹا (عیسیٰ مسیح) اور روح القدس کے قائل نہیں
ہیں۔ جس چیز کو انھوں نے پسند کیا اور جس پر انھوں نے زور دینا چاہا
وہ مسیحی روح یعنی عاجزی، صبر، انسانی ہمدردی اور شفقت ہے جو بڑے پیمانہ
پر بنی نوع انسان کے اتحاد اور امن کو عملاً فروغ دیتے ہیں۔

اس کتاب کو ترتیب دینے سے رام موہن کی نیت یہ تھی کہ وہ ہندو
اور مسلمانوں کو عیسائی مذہب کی بنیادی ہدایات سے آشنا کرائیں لیکن تثلیث
اور عیسیٰ مسیح کے معجزات میں ان کی قطعی بے اعتقادی نے عیسائیت کی تبلیغ

جماعتوں کو ناراض کر دیا تھا کیونکہ ان کے فرقہ کے عقائد یسوع مسیح کے معجزات اور مقدس تثلیث کی قبولیت کے سہارے ہی مسلمہ طور پر قائم رہ سکتے ہیں۔ اُسی زمانہ میں عقیدۂ تثلیث سے امریکہ اور یوروپ میں کچھ عیسائی لوگ اتفاق نہیں کر رہے تھے۔ وہ مخالفین جو ایک بے پیکر خدا میں یقین رکھتے تھے موحدین کہلائے گئے۔ زمانہ گزشتہ میں موحدین حقیقی عیسائی فرقہ کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیے گئے۔ ہندوستان میں عیسائیت کی اُن تبلیغی جماعتوں نے جن کا تعلق مسلّمہ کلیسا سے تھا اس بات کو پسند نہیں کیا اور جب تمام اشخاص میں ایک ہندو کی طرف سے ایسی مخالفت سامنے آئی تو انھوں نے بہت ہی زیادہ ناراضگی محسوس کی۔ واضح ہو کہ یہ تبلیغی جماعتیں انسانیت کی بہترین خدمتگار تھیں۔ وہ اپنے عقیدہ کی صرف انھیں باتوں پر جن میں وہ بہت ہی پختہ یقین رکھتے تھے زود حس تھے۔ انھوں نے اپنے اخبارات میں بغیر کسی بندش کے رام موہن پر حملے کیے۔ ڈاکٹر مارش مین (Dr. Marshman) نام کا ایک مشہور مبلّغ تو (جو ولیم کیری کے ساتھ اولین بنگالی نثر نگاروں میں سے تھا) اس حد تک بڑھ گیا کہ اس نے رام موہن کو ایک ایسا ذہین کافر بتلایا جس کا ذہن ابھی تک نجات دہندہ کے مجسّم ہونے کے عظیم منصوبے کا مکمل مخالف ہے۔

رام موہن نے ایک نہایت مدلّل پمفلٹ کے ذریعے اُس کی پرجوش

مدافعت کی۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ ایک بالاتر ہستی میں یقین رکھنے والا جس نے بُت پرستی اور اُس سے پیدا ہونے والے رواجوں کو ترک کر دیا ہو کسی طرح بھی کافر نہیں کہا جا سکتا لیکن ان مبلغوں کی نظر میں وہ شخص جو عقیدہ تثلیث کی تائید نہیں کرتا عیسائی نہیں ہو سکتا تھا اور جو عیسائی نہیں تھا وہ کافر خیال کیا جاتا تھا اور ایک کافر کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ مسیحی عقائد پر تنقید کر سکے لیکن چونکہ اس مخصوص میدان میں اُن کے علم کی گیرائی کا انکار نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے اس بات کی کوشش کی گئی کہ کلکتے کے پادری جیسے معزز شخص ان کو عیسائی ہونے کی دعوت اس ترغیب کے ساتھ دیں کہ وہ ایسا کر کے اپنے عمدہ معاش کے لیے راہ ہموار کر لیں گے لیکن رام موہن نے جن کا موحدانہ عقیدہ ہندو فلاسفی سے اخذ کیا گیا تھا قبول کرنے سے اِنکار کر دیا اور اس لیے تین طویل سالوں تک قلمی جنگ جاری رہی۔ وہ مبلغوں کی تنقیدوں کا جواب شائع کرتے رہے۔ اس وقت عیسائیت کی تبلیغی جماعتیں بنگال کے تقریباً تمام چھاپہ خانوں کی مالک بنی ہوئی تھیں اس لیے انھیں بیپٹسٹ مشن پریس (Baptist Mission Press) میں اپنے جوابات شائع کرانے کے لیے جانا پڑا۔ اس پریس نے ان کا دوسرا جواب شائع کرنے سے اِنکار کر دیا اس لیے انھوں نے توحید پرستی کے تحفظ کی خاطر اشاعت کے لیے ایک پرنٹنگ پریس خود خرید لیا۔ ایک مبلّغ نے جس کا نام ولیم آدم

تھا جماعت کو چھوڑ کر توحید پرست عیسائیت کا داعی بن گیا تھا۔ توحید پرستوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ خدا سب کا باپ ہے اور سب انسان بھائی بھائی ہیں۔ وہ عیسیٰ مسیح کو ایک عظیم معلم اور نظیر کی حیثیت سے مانتے ہیں نہ کہ خدا کے بیٹے کی حیثیت سے۔ نتیجتاً یہ بات مسلمانوں، یہودیوں اور ویدانت کے ماننے والے ہندوؤں کے عقیدۂ ربانی کے موافق ہے اور رام موہن کی نظر میں یہی عقیدہ دُنیا کے تمام انسانوں میں اخوت کی بنیاد بناتا ہے خواہ انسان مختلف مذہبی فرقوں سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں۔

موحدانہ انجمن:

رام موہن نے کلکتہ میں موحدین کی انجمن کی تشکیل میں مدد دی جس میں منتخب انگریزوں اور ہندوستانیوں کی ایک مختصر جماعت نے شرکت کی۔ ہندوستانیوں میں رام موہن کے علاوہ پرنس دوارکاناتھ ٹیگور، راجا پرسنا کمار ٹیگور اور رادھا پرشاد رائے شامل تھے۔ ان ممبران کا مقصد یہ تھا کہ جہالت اور توہم پرستی کو دُور کیا جائے۔ نیز علامات، فرائض اور مسیحی مذہب کے اصولوں کے بارے میں تعلیم اور استدلالی مباحثہ کے ذریعے اور انگریزی و ملکی زبانوں میں کتابیں شائع کر کے معلومات بہم پہنچائیں۔ رام موہن نے کافی مقدار میں انجمن کے فنڈ میں چندہ دیا اور اس بات کا لحاظ رکھا کہ آدم کو نگہداشت کے مصارف کے لیے ایک معقول رقم مل جائے۔

عیسائی نیز ہندو قدامت پرست حلقوں میں مختلف مذاہب کے لوگوں کے ذریعے اس مشترک جدوجہد پر بڑی نکتہ چینی کی گئی۔ رام موہن نے یہ بات بتلاتے ہوئے ہندو صاحبان کے مراتب کا تحفظ کیا کہ تمام مذاہب میں ایک ہی خدا کی عبادت پائی جاتی ہے اور عیسائیت نیز ویدانت کی تمام مذہبی کتابوں میں خدا کی وحدانیت کی حمایت کی گئی ہے تاکہ دونوں مذہبوں کے ماننے والے اپنے الگ الگ مذاہب کو چھوڑے بغیر آپس میں مل سکیں۔ انھوں نے فرمایا کہ "ہر قوم میں وہ شخص جو خدا سے ڈر کر صحیح راستے پر چلتا ہے اس کے نزدیک قابلِ قبول ہے خواہ اس کو خدائے پاک کی عظمت کی تعلیم کسی بھی شکل میں دی گئی ہو"

ہمہ گیر قدر شناسی:

رام موہن یوروپ اور امریکہ کے مذہبی حلقوں میں موحدانہ مباحثہ کی وجہ سے مشہور ہو گئے۔ ان عیسائی عالموں اور فلاسفروں (جن میں سے جرمی بنتھم (Jeremy Benthan). بھی ایک ہے) نے ان کے ساتھ خط و کتابت کی۔ ان میں سے کچھ اُن کے گہرے دوست بن گئے تھے۔ ان کے مشورہ اور حوصلہ افزائی پر پریس بیٹرین (Presbyterians) جو پروٹسٹنٹ عیسائیوں (Proestestant Christians) کا ایک دوسرا فرقہ ہے (جس میں اراکین اپنے پادری اور دفتری عملہ کو خود منتخب کرتے ہیں)

ہندوستان میں کام کرنے کے لیے آئے۔ رومن کیتھولک یسوعی (Roman Catholic Jesuits) کی طرح انھوں نے ملک کے اندر بہت سے اسکول، کالج اور ہسپتال قائم کیے اور بلا امتیاز مذہب لوگوں کی حسب ضرورت خدمت کی۔

اس طرح رام موہن کی سرگرمیاں ایک وسیع رقبہ میں پھیل گئیں ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں نے ان کو اس درجہ اہمیت دی کہ ان کے متعلق برطانوی اخبارات میں بھی رپورٹیں شائع ہونے لگیں۔ ۱۸۲۳ء میں شائع ہونے والے اخبار ایڈن برگ ریویو (The Edinburgh Review) میں اس دعوت کی تفصیل بیان کی گئی جو انھوں نے اسپین کی حکومت سے حاصل کردہ جنوبی امریکی ہسپانوی نوآبادیات کی آزادی منانے کے سلسلے میں کلکتہ میں دی تھی۔ ہسپانیوں نے اس برصغیر میں اپنی آبادیاں بسائی تھیں اور وہاں ایک بڑی حکومت قائم کرلی تھی جس کو انھوں نے جابرانہ اور وحشیانہ طریقوں سے برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی۔ مقامی باشندوں نے اُن کو پسپا کرکے آزاد جمہوریہ حکومت بنالی تھی۔ رام موہن کی ہمدردیاں ہمیشہ اُن لوگوں کے ساتھ رہی ہیں جو دنیا میں کہیں بھی قومی آزادی کے لیے لڑے ہیں۔ علاوہ ازیں ہسپانوی حکومت ان لوگوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کی وجہ سے بدنام تھی جو قدامت پرست رومن کیتھولک عقیدے سے اختلاف کرنے کی جرأت کرتے

تھے۔ یہ ظالمانہ طریقہ (Inquisition) (رومن کیتھولک کے ذریعے کافروں کو سزا دینے کے لیے قائم کی جانے والی مذہبی عدالت) کہلایا۔ اس طرح رام موہن کو ہسپانوی حکام کے رویّہ سے دوہری نفرت پیدا ہو گئی تھی اور انھوں نے جنوبی امریکہ کے ان فاتح باغیوں کو مبارکباد دی جنھوں نے دونوں طرح کے خوف کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔ خود اسپین میں ایک آزاد خیال فرقہ نے چرچ کے غلبہ سے گورنمنٹ کو آزاد کرانے کی تحریک چلائی تھی۔ رام موہن نے ان ہسپانوی آزاد خیال لوگوں سے تعلق پیدا کر لیا تھا جو اُن کی اس درجہ عزت کرتے تھے کہ جب انھوں نے ۱۸۱۲ء میں اسپین کے لیے ایک مثالی آئین کا مسودہ تیار کر کے (کچھ مورخین کے نزدیک یہ جدید ہسپانوی قوم کی تشکیل کے آغاز کی نشان دہی کرتا ہے) اس کو fiberalissimo (نہایت آزاد خیال) Noble, Sabio (ذی عقل) اور Virtuoso (راست باز) Brano (برہمن) رام موہن رائے سے معنون کیا تھا۔ رام موہن کو آزادیٔ خیال اور مذہبی عقائد کا اظہار بڑا عزیز تھا۔ ان کا یقین تھا کہ آزادی کا منشاء خدا کا منشا ہے۔

7 مصنف و معلم

جب رام موہن عیسائیت کی تبلیغی جماعتوں کے ساتھ بحث و مباحثہ میں مشغول تھے تو ہندو قدامت پرستی کے حامیوں کے ذریعے اُن پر مسلسل حملے کیے جا رہے تھے۔ عیسائیت کے مبلغوں نے اپنے انگریزی اور بنگالی اخباروں میں ان پر نکتہ چینیاں کیں اور قدامت پرست ہندوؤں نے ایک ایسے بنگالی اخبار میں ان کی مخالفت کی جس کا تعلق کسی تبلیغی جماعت سے نہیں تھا۔

رائے عامہ کو تشکیل دینے کے لیے اخبارات:

رام موہن رائے نے عامہ کو تربیت دینے کے لیے اپنے ذاتی اخبار کا ہونا ضروری سمجھا۔ ۱۸۲۱ء میں انھوں نے ایک بنگالی ہفتہ وار اخبار جس کا نام سمبد کومودی (Sambad Kaumudi) تھا، جاری کیا اور اس کے

ایک سال بعد فارسی کا ایک ہفتہ وار مراۃ الاخبار شائع کیا۔ دونوں رسالوں میں بہت سے موضوعات پر مضامین شائع ہوتے رہے۔ اوّل الذکر اخبار کے ایک مضمون میں انھوں نے ہندوؤں کو مشینوں کا استعمال کرنے کے لیے اکسایا تاکہ وہ اپنے آرام، خوشی اور آزادی کی طرف راغب ہو سکیں۔ موخر الذکر اخبار کے ایک مضمون میں آئرلینڈ کے اندر بے چینی اور بے اطمینانی کے وجوہات بیان کیے جہاں برطانوی لوگ عوام کی خواہش کے خلاف بے رحمی سے حکمرانی کر رہے تھے۔ یوروپ میں برطانیہ کی پالیسی پر رام موہن کی تنقید اس قدر صاف گو تھی کہ بہت سے انگریزوں نے اس کو پسند نہیں کیا مگر اس وقت ہندوستان کے پریس کو آزادی حاصل تھی اس لیے وہ اس بارے میں کچھ نہ کر سکے لیکن ۱۸۲۳ء میں ایک نئے گورنر جنرل جان آدمس John Adams نامی شخص نے دفتر کا چارج سنبھال لیا جس نے سب سے پہلے پریس آرڈیننس (Press Ordinance) اس مقصد سے جاری کیا تاکہ ایسے معاملات کو کچل ڈالا جائے جن سے گورنمنٹ کے خلاف نفرت اور توہین کا رجحان پایا جائے نیز سوسائٹی میں نقصِ امن کا اندیشہ ہو۔ یہ آرڈیننس حال ہی میں بار بار اخباروں میں شائع کر کے مشتہر کیا گیا۔ یہ بھی قرار پایا کہ کوئی اخبار سرکار سے لائسنس حاصل کیے بغیر شائع نہیں کیا جائے گا اور اس طرح گورنمنٹ اپنی مرضی سے کسی بھی اخبار کو بند کر دینے کی حق دار ہو گئی۔

ایک آزادانہ پریس کے لیے استدلال:

موجودہ قانون کے تحت آرڈیننس پر سپریم کورٹ کی منظوری ہونی باقی تھی جس نے اعلان کیا کہ اس سلسلہ میں اگر عوام کو کوئی عذر ہو تو پیش کریں۔ رام موہن سب سے پہلے عذر پیش کرنے والے تھے۔ اس موضوع پر آزادانہ پریس کی حمایت میں ان کی عرضداشت ایک بہترین بحث سمجھی گئی۔ لیکن نہ تو کلکتہ میں سپریم کورٹ نے اور نہ ہی لندن میں پریوی کونسل نے ہندوستان کے لیے پریس کی آزادی کو بحال کیا۔ شہری آزادی کی اس مداخلت کے خلاف احتجاج کے طور پر رام موہن نے تھوڑے عرصے بعد ہی یہ اعلان کرتے ہوئے 'مراۃ' کی اشاعت بند کردی کہ ایسی شرائط کے تحت جنھیں میں باعث تذلیل محسوس کرتا ہوں اس کی اشاعت جاری رکھنے سے مجبور ہوں اور افسوس ظاہر کیا کہ میں اپنے ہم وطن انسانوں کی ذہنی ترقی میں اب آگے مدد نہیں دے سکتا۔

جدید بنگالی نثر کا رہنما:

عام اصطلاح میں رام موہن ایک انشاء پرداز یا ادیب نہیں تھے۔ مگر وہ بنگالی نیز انگریزی اور فارسی میں سیر حاصل لکھنے والے تھے۔ ہندوستان میں چھاپہ خانہ کے آنے سے قبل (۱۸۰۰ء میں جبکہ وہ ۲۸ سال کی عمر کے تھے) بنگالی ادب زیادہ تر نظم پر مشتمل تھا۔ ہر زبان میں نثری تحریر چھاپہ خانہ کی

ایجاد اور اُس کے استعمال کے ساتھ ترقی کرتی گئی جس کی وجہ سے کتابوں، پمفلٹ اور رسالوں کی ایک کثیر تعداد شائع ہوکر وسیع پیمانے پر تقسیم کرنا ممکن ہوگیا۔ بنگال میں عیسائیت کی تبلیغی جماعتوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے بنگالی زبان میں کچھ کتابیں اور ہفتہ وار رسالے ابھی چھاپنے شروع کیے تھے۔ دیسی محاوروں سے ناواقفیت کی بنا پر وہ اکثر صحیح الفاظ کے استعمال میں ناکام رہے اور انھوں نے ایک ایسا بے ڈھنگا طرز اختیار کیا جس کی وجہ سے پڑھنا بے لطف اور مشکل بن گیا تھا۔ ویدانتی ادب کے ترجمے جو رام موہن نے کیے بنگالی نثر میں فلسفیانہ مضامین پر سب سے پہلی کوششیں تھیں اور ان کے ہفتہ وار نے سماجی، تاریخی، مذہبی اور سیاسی موضوعات پر مضامین فراہم کیے۔ بلاشبہ وہ جدید بنگالی نثر کے رہناؤں میں سے ایک تھے۔

رام موہن کے کارناموں نے ایک دوسری راہ بھی اختیار کی۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ انھوں نے ڈیوڈ ہیئر کے اسکول (David Hare's School کے سرپرستوں کی فہرست سے اپنا نام واپس لے کر کس طرح ترقی بخشی۔ انھوں نے اپنا اینگلو ہندو اسکول جاری کیا جس میں عیسائیت کے نظریات کی تعلیم نہیں دی گئی بلکہ بڑی ہوشیاری سے اخلاقی اصولوں کی تعلیم دی گئی اور جن طلباء میں عام تاریخ کے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی انھیں عیسائیت کے

تاریخی حقائق پڑھائے جاتے وہ نوجوان طلباء سے تمام مذاہب کے سمجھنے اور ان کی تنظیم کرنے اور گھر پر نیز سماج میں ایک صحت مند اخلاقی زندگی گزارنے کی خواہش رکھتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ہندو مذہب اگر اپنے بےہودہ رسومات کو ترک کردے تو خدائے واحد کے عقیدہ کی بنیاد پر وہ ہندوستان کے تمام فرقوں اور تمام مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان کی ایک زندہ کڑی بن سکتا ہے۔ اس طرح ایک دوسرے سے تعلق پیدا کرنے کا احساس اور ایک مشترک ہندوستانی قومیت کا مادہ ابھر کر ترقی پائے گا۔ مذہب کا سب سے اعلیٰ کارنامہ بلاشبہ انسان کو خدا کی حقیقت سمجھانے میں مدد دینا ہے۔ یہ ایک جستجو کی شے ہے جس میں ہر انسان کو خدا تک پہنچنے کے لیے اپنی ایک راہ تلاش کرنی اور بنانی ہوتی ہے لیکن مذہب کا ایک سماجی مقصد بھی ہے۔ یہ انسان کو سوسائٹی کا ایک فرد مان کر اس کی رہبری کرتا ہے اور اس کے کاموں کو منضبط کرتا ہے۔ یہ مذہب کا اخلاقی کارنامہ ہے۔ اپنی اعلیٰ ترین شکل میں ہندو مذہب نے خدا کو حاصل کرنے کا راستہ دکھایا ہے لیکن مجموعی طور پر اس کے اخلاقی پہلو میں کمی پائی جاتی ہے۔ ہندو سماج مختلف غیر مربوط حصّوں میں منقسم تھا اور بے معنی رسومات و اوہام پرستی کی وجہ سے اس قدر تنگ نظر تھا کہ تمام ہندو مساوی حیثیت سے آپس میں ایک دوسرے کے نزدیک نہ آسکتے تھے۔ سماجی اخلاقیات کا سب سے پہلا اصول سب کو ساتھ ملانا ہے۔

اس لحاظ سے اسلام بہتر تھا اور عیسائیت اس سے بھی زیادہ بہتر تھی یہی
وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے اسکول کے نصاب میں مذہبی تعلیم کو شامل کیا۔

اس وقت ہندوستانیوں کے لیے قرار دی جانے والی تعلیم کے
نزاع میں گورنمنٹ الجھی ہوئی تھی۔ وہ ملک پر حکومت کرنے میں مدد دینے کے
لیے انگریزی جاننے والے ہندوستانیوں کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔
سوال یہ تھا کہ آیا انگریزی زبان کا معمولی سا کچھ علم روایتی انداز کی مادری تعلیم کے
ساتھ ہو جانا کافی ہے یا جدید تعلیم ہونی چاہیئے یعنی وہ تعلیم جو سائنس ٹکنالوجی اور
مغربی فلاسفی کے مختلف شعبوں میں ہے۔ گورنمنٹ کلکتہ میں ایک کالج قائم کر کے
سنسکرت کے مطالعہ کو ترقی دینے کی تجویز پر غور کر رہی تھی۔ رام موہن اس خیال
کے سخت مخالف تھے۔ گورنر جنرل کو اپنی یادداشت میں جو کہ اب مشہور ہو گئی ہے
انھوں نے یہ بحث کی تھی کہ اس مقصد کو موجودہ سنسکرت Chatuspaithis
(روایتی انداز کی درسگاہوں) کو کافی مقدار میں عطیات دے کر اچھی طرح پورا کیا جا
سکتا ہے لیکن ہندوستان کے مفاد کے لیے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت
ہے وہ تعلیم کا بے تعصبانہ اور روشن خیالی کا وہ طریقہ ہے جس میں ریاضی، نیچرل
فلاسفی، کیمسٹری، علم تشریح اور دوسرے مفید علوم کی تعلیم شامل ہو۔ اس دلیل
نے ۱۲ سال کے بعد ۱۸۳۵ء میں سرکار کے اس فیصلہ کی بنیاد رکھی کہ تعلیم کا جدید
طریقہ انگریزی ذریعہ تعلیم سے شروع کیا جائے اور تب ہی سے انگریزی زبان

فارسی کے بجائے ہندوستان کی سرکاری زبان بن گئی۔

دو کالجوں کا افتتاح:

رام موہن کی یادداشت کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ سرکار نے کلکتہ میں ایک کالج کے بعد دو کالج اور کھول دیے۔ ایک سنسکرت کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اور دوسرا انگریزی ذریعہ تعلیم رکھ کر جدید تعلیم کے لیے۔ ویدانت کی تعلیم کی اشاعت اور ہندوستانی فلسفیانہ وراثہ کے کلچر کی ترقی کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے رام موہن نے خود ایک ویدانتی کالج قائم کیا جس میں انھوں نے جدید سائنس کی تعلیم کا بھی انتظام فرمایا۔ سب سے بالاتر یہ کہ انھوں نے روشن خیال ہندوسیت کی ایک مضبوط دیوار بنانی چاہی تاکہ عیسائیت کی تبلیغی جماعتوں اور روایت پسند ہندوؤں کے حملوں کا دفاع کیا جاسکے کیونکہ روایت پسند ہندو ان طاقتوں کو نہیں دیکھ پا رہے تھے جنھوں نے ہندوستان میں اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

اصلاح و ترمیم کے لیے راہ ہموار کرنا:

نیز اسی وقت رام موہن اس بات کے خواہاں تھے کہ برطانوی سرکار کے ملازمین، علماء اور خصوصاً مبلغین کو سب سے پہلے عوام کے ذہن و کردار کو سمجھنے کے لیے مقامی زبان پر اطمینان بخش قابو ہونا چاہیے۔ ۱۸۲۶ء میں انھوں نے انگریزی میں بنگالی زبان کی ایک قواعد شائع کی۔ اگرچہ یہ سب

سے پہلی بنگالی قواعد کی کتاب نہیں تھی کیونکہ ہال ہیڈ (Hal hood) نامی مبلغ سب سے پہلی قواعد کی کتاب ۱۷۷۸ء میں شائع کر چکے تھے پھر بھی یہ سب سے پہلی کتاب تھی جو ایسے شخص کے ذریعے لکھی گئی تھی جس کی مادری زبان بنگالی تھی ان کی بنگالی تحریریں بہت کچھ فلسفیانہ موضوعات پر مشتمل تھیں اور انھوں نے دیکھا کہ اگر بنگالی زبان پڑھنے والے انگریز طلباء بنگالی زبان کے کلمات کو نہ سمجھیں گے تو بنگالیوں کی تقریر و تحریر کے صحیح مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ اس سلسلہ میں آپ کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ بنگالی نثر اسی وقت وجود میں آئی تھی اور یہ ان کی پہلی راہ دکھانے والی کوشش تھی۔ ایسی پہلی تمام کوششوں کی طرح اس میں بھی ترقی کے لیے گنجائش تھی لیکن یہ اُن کی غیر فانی شہرت کو قائم رکھے گی کیونکہ انھوں نے اس ابتدائی نثر کو بلند ترین خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اپنے بعد ہونے والی اس کی حیرت انگیز ترقی کے لیے ایک مستحکم بنیاد رکھی۔ اُن کے زمانہ سے قبل ہندو مذہب کی کتابوں کو سنسکرت کے علاوہ جو دیوتاؤں کی زبان مانی جاتی تھی کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی ممانعت تھی۔ عوام کی زبان میں اس بلند ترین ادب کو مہیا کر کے انھوں نے بنگالیوں کے لیے وہ ہی خدمت انجام دی جو سائیرل Cyril- اور میتھوڈیس Methodius- نے بلغاریہ کے لوگوں کے لیے اور وکلیف Wycliffe نے انگریزوں کے لیے اور لوتھر نے جرمنوں کے لیے انجام

دی تھی۔ ان عظیم مصلحوں نے عیسائیت کے مذہبی ادب کو اصل عبرانی (HEBREW) اور لاطینی (LATIN) سے اپنی مادری زبانوں میں منتقل کیا تھا۔ کیونکہ ان عبرانی اور لاطینی زبانوں کو بہت ہی کم لوگ پڑھ سکتے تھے اور بہت بڑی اکثریت کو انہیں دوسرے لوگوں کے ذریعے بتلانا پڑتا تھا۔ اس نے بالآخر لوگوں کے ذہنوں اور خیالات پر وہ ہی اثر ڈالا جو ایک جمہوری ملک میں بالغ رائے دہی کا حق ڈالتا ہے۔ مذہبی طبقہ کا اقتدار ڈگمگانے لگا اور اصلاحات و ترمیمات کے لیے راہ صاف ہونے لگی۔

8۔ برہم سماج

رام موہن کے موحدانہ عقیدہ اور یسوع مسیح کی اخلاقی تعلیمات کے متعلق ان کی واضح ترجیح نے بہت سے انگریزوں اور ہندوستانیوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا کہ آیا وہ اس کے باوجود ایک عیسائی ہیں انگریزوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ ہندو دھرم کا مطلب ہمیشہ بت پرستی، ذات پات اور اوہام پرستانہ رسومات سے ہے اور اسی وجہ سے وہ شخص جو ایک غیر متشکل خدا میں یقین رکھتا ہے اور سماجی بے عنوانیوں کا مخالف ہے ضرور ایک عیسائی ہے روایت پسند ہندوؤں کا ان کے ویدانتی اصولوں سے تو کوئی جھگڑا نہیں تھا لیکن ہندو سوسائٹی سے بد اطواریوں کو دور کرنے کی کوششوں کی بنا پر وہ انھیں ہندو مذہب کا دشمن تصور کرتے تھے۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ ان بے عنوانیوں اور بری رسومات کی کوئی سند قدیم مذہبی

کتابوں سے نہیں ملتی ہے لیکن روایت پسندوں نے کٹرپن سے دلیل پیش کی کہ یہ طویل عرصے تک استعمال کی وجہ سے منظور شدہ ہیں اور اس وجہ سے ان میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں لائی جانی چاہیے کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ اگر مساوات کے رجحانات کو فروغ ہوا تو اس کے نتیجہ میں ہندو سماج کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اس کے برعکس رام موہن نے دیکھا کہ ہندو سماج حقیقت میں ختم ہوتا جا رہا ہے اور انھیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ہندو سماج کو استدلالی بنیادوں پر دوبارہ مکمل تنظیم کر کے ہی بچایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ مذہب کا موجودہ طریقہ جس سے ہندو چمٹے ہوئے ہیں اُن کے سیاسی مفاد کی ترقی کے لیے ہرگز مناسب نہیں۔ ذات پات کے امتیاز نے جس کی وجہ سے وہ آپس میں تقسیم در تقسیم ہو گئے ہیں انھیں حب وطن کے جذبات سے مکمل طور پر محروم کر دیا ہے اور مذہبی رسومات کی کثرت اور تزکیہ نفس کے قواعد نے انھیں کسی مشکل مہم کی ذمہ داری برداشت کرنے کے بالکل نااہل بنا دیا ہے۔ رام موہن نے نتیجتاً لکھا ہے کہ میرا خیال ہے کہ ہندو مذہب میں کم از کم ہندوؤں کے سیاسی مفاد اور سماجی راحت و آرام کے لیے کچھ تبدیلی ضروری ہے۔ انھوں نے مسیحی اخلاقیات کو ترجیح دی کیونکہ یہ فروغ پذیر اور استدلال پر مبنی تھی۔ لیکن انھوں نے محض اس مذہب کے مطالعہ تک ہی خود کو محدود نہیں کیا۔ ۲۵۰۰ سال قبل بودھ نے اخلاقی

اصولوں اور انسان کی خود ساختہ سماجی امتیازات کے خاتمہ کی تبلیغ کی تھی۔ انھوں نے بودھ دھرم کے قدیم ادب کی ایک کتاب وجرا سوچی (Vajra Suchi) کا بنگالی میں ترجمہ کرکے یہ دکھلایا کہ عیسائیت کے اخلاقی اصول ہندوستانی ورثہ کی عظیم روایات سے حقیقت میں مختلف نہیں تھے۔

توحید پرستی کا غیر ممالک میں گہرا اثر:

رام موہن کلکتہ میں موحدین کی جماعت کے ساتھ قریبی شریک کار بن گئے کیونکہ ان کا یقین تھا کہ ایک خدا کو تسلیم کرنا ہی تمام مذاہب کے روحانی رشتہ کو قائم کرتا ہے اور باہمی افہام و تفہیم اور تمام لوگوں کے درمیان ہمدردی کو پیدا کرتا ہے۔ انھوں نے کلکتہ میں موحدین کی گرجا گھر کی عمارت کے لیے کافی مقدار میں چندہ بھی دیا اور اپنی وصیت میں اس کے لیے پادری اپنے معزز دوست آدم (ADAM) کا اہتمام کیا۔ ان کی پیش قدمی اور رہنمائی نے یورپ اور امریکہ میں موحدین کی تحریک پر دوررس اثرات ڈالے تھے۔ ان کے اس اثر کا پتہ انگلینڈ میں برطانوی اور غیر ملکی موحدین کی جماعت کی تشکیل سے لگتا ہے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ یہاں عیسائیت کی اصطلاح کا استعمال نہیں کیا گیا بلکہ 'برطانوی' کے بعد 'غیر ملکی' لفظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کا آغاز ایک بین الاقوامی جماعت کی حیثیت سے ہوا اور اس نے مذہبی خیالات کی آزادی کے لیے ایک عالمی تحریک کی ابتدا کی۔

برہمو سماج کی بنیاد:

لیکن کلکتہ کی توحید پرست تبلیغی جماعت کو ہندؤں کی طرف سے کوئی تعاون نہیں ملا۔ اگرچہ رام موہن کا یہ مدعا تھا کہ ایک خدا میں یقین رکھ کر تمام مذاہب کی بنیادی وحدت میں دلچسپی پیدا کرائی جائے اور ہندوستانیوں کی خودداری یہ دکھلا کر بحال کی جائے کہ ویدانت کے ہندوستانی مذہب کا فلسفہ دنیا میں سب سے بلند اور برتر ہے۔ اُن کے ہندوستانی دوستوں نے اُنھیں مشورہ دیا کہ ہندوستانیوں کی ایک انجمن بنانا زیادہ مفید ثابت ہوگا جہاں وہ اپنے طریقہ سے اور اپنی مادری زبان میں ایک خدا کی عبادت کرسکیں گے اور سماجی اصلاح کے بڑے کاموں میں تعاون دے سکیں گے۔ اس طرح ۲۰ اگست ۱۸۲۸ء کو برہم سماج کی بنیاد پڑ گئی جو بعد میں برہمو سماج کہا گیا۔ ادبی لحاظ سے اس کا مطلب ایک ایسی سوسائٹی سے ہے جو برہم (قادرِ مطلق) کے ماننے والوں پر مشتمل ہو۔ ہفتہ واری عبادتی مجلسوں میں ویدوں کی تلاوت اور مذہبی بھجن ہوتے اور پڑھے گئے اشلوکوں کے بارے میں ودوانوں (علماء) کا اظہار خیال ہوتا۔ اس سماج نے کلکتہ کے تعلیم یافتہ شہریوں میں جلد ہی ایک مقام پیدا کرلیا جن کی ایک کثیر تعداد عبادتی مجلسوں میں شمولیت کرتی تھی۔ اس نے جدید ڈھنگ سے اجتماعی عبادت کی قدیم ویدک روایت کو پھر سے زندہ کردیا۔

اس تمام عرصہ میں رام موہن کو بہت زیادہ دباؤ کے تحت رہنا اور کام کرنا پڑا۔ انھیں نہ صرف بہت سی مختلف سرگرمیوں کا بھاری بوجھ کندھوں پر اٹھانا پڑا بلکہ قدامت پرست ہندوؤں اور عیسائی مبلغوں کی سخت مخالفت کا مقابلہ بھی کرنا پڑا۔ ان کے رشتہ داروں اور دوستوں نے قانونی عدالتوں میں یکے بعد دیگرے مقدمات دائر کرکے انھیں پریشان کر دیا۔ ان کے بیٹے کو ایک جھوٹے مالی مقدمہ میں الجھا لیا گیا۔ ان کی بیوی شکستہ دل ہوکر انتقال کر گئی اور انھیں مار ڈالنے کی سازش کی گئی۔ یہ تمام ایذا رسانیاں ان کو اس راستے سے باز رکھنے میں ناکام رہ گئیں جو انھوں نے اپنے لیے منتخب کیا تھا لیکن انھیں اس کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ ان کا فولادی جسم مشکلات میں سخت کام کے دباؤ کے باعث مسمار ہوگیا۔

ہندوستان کا نشاۃ ثانیہ:

برہم سماج کو اس قدر حوصلہ افزا تعاون ملا کہ اس کے شروع کرنے سے ۲ سال کے اندر ہی رام موہن اس لائق ہو گئے کہ انھوں نے پرارتھنا سبھا کے لیے ایک مندر بنانے کے سلسلہ میں مکان خریدنے کے لیے اچھا خاصہ فنڈ جمع کر لیا۔ عمارت کے انتظام کے لیے جو عام سبھا کے لیے بھی استعمال کی جا سکتی تھی ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا۔ اس طرح ایک طاقتور پودا لگا دیا گیا جس نے جلد ہی ہندوستانی سماج میں کافی گہری جڑیں قائم کرلیں اور جو

براہ راست اور بالواسطہ سماج کی دوبارہ معقول تنظیم کے لیے ایک عظیم تحریک کی بانی بن گئی اور اس نے قدیم ہندوستانی ورثہ کی پھر سے تحقیق کی جس کو ہندوستانی نشاۃ ثانیہ یا بیداریٔ نو کے نام سے پکارا گیا ہے۔ وہ تمام لوگ جو سماج کے اغراض و مقاصد کے گرویدہ تھے بلاشبہ انھوں نے عبادت کی مجلسوں میں متواتر شرکت نہیں کی۔ ان میں سے کچھ مخلصانہ طور پر یہ یقین رکھتے تھے کہ خدا خود کو بہت سی شکلوں میں ظاہر کرسکتا ہے لیکن یہ سماجی اصلاحات فوری طور پر ضروری تھیں اور انھوں نے اس مقصد کے لیے ہندو جماعت ہی میں رہ کر کام کیا۔ کچھ دوسرے لوگ وہ تھے جن کے اندر اپنے ماحول اور قدامت پرستی کی بندشوں کو توڑنے کی جرأت نہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ برہم سماج سے ہمدردی رکھتے تھے۔ قدامت پسند ہندو سماج کے رہنماؤں کو خطرہ محسوس ہوا اور انھوں نے موجودہ دھرم کو بچانے کے لیے جس کو وہ سناتن دھرم یا دائمی مذہب کہہ کر پکارتے تھے دھرم سبھائیں قائم کیں۔

برہم سماج کی نشوونما:

اگرچہ رام موہن داس تحریک کو دیکھنے کے لیے زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکے تو بھی یہ تحریک جس کا آغاز برہم سماج کے ذریعے ہوا تھا بہت سے پہلوؤں کے ساتھ تحریک کی شکل میں پھیل گئی جس نے ہندوستانی زندگی میں

ایک زبردست ہلچل پیدا کردی۔ ملک کے تمام حصوں میں مصلحین پیدا ہو گئے
رام کرشن پرم ہنس، سوامی وویکانند، کیشو چندر سین، سوامی دیانند، رابندر ناتھ
ٹیگور، سری آربندو، بال گنگادھر تلک اور دوسری عظیم شخصیتوں نے ہندو مذہب
کو ایک جدید اور سماجی مقصد بخشا جس کی زمانہ گزشتہ میں کمی پائی جاتی تھی
سیاسی بیداری ظہور میں آئی اور ہندوستانی قومیت کا طلوع ہوا۔ ان تمام
چیزوں کے آنے میں ایک طویل وقت لگا اور برہم سماج کے افراد سماج کے
عظیم جبر و تشدد کے شکار ہوئے اور ایک طویل عرصہ تک ہندو سماج سے
ان کا بائیکاٹ رہا۔ تاہم برہم سماج نے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن کو ہندوستان
کے قدیم ورثہ اور اس کے اعلیٰ فلسفیانہ مواد کی طرف متوجہ کیا اور اس طرح
عیسائیت کی تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں کے اقدام کو روک کر ہندو مذہب
کے لیے ایک بڑی خدمت انجام دی۔ جدید خودداری جو ظہور میں آئی اس
نے اس ذہنیت کو روکنے میں مدد دی جو مغربی طریقوں کی کورانہ تقلید کی حامی
تھی اور جس کا پہلا درجہ مخصوص حلقوں میں جدید تعلیم کی شکل میں ظاہر ہوا۔
اس نے ہندوستان میں قومی جذبات کو بھی جنم دینے میں مدد دی۔ برہم
سماج نے ہندوستانی کلچر کے مستقل اقدار کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مغربی
علوم کی اشاعت کا بھی رہبرانہ کام انجام دیا اور رفاہ عام کے لیے بہت سے
رہنما اور اعلیٰ لیاقت کے جان نثار اساتذہ کو پیدا کیا۔ جب آپ ہندوستان کی

بیداری کی دل کش کہانی کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو برہم سماج کے عملیات کے بارے میں اور زیادہ معلومات ہوں گی۔ سماجی اصلاحات جن کے لیے رام موہن لڑتے رہے اور جن کی اُن کے زمانہ میں قدامت پرست لوگوں کے ذریعے سخت مخالفت کی جاتی رہی ایک عرصہ کے بعد آزاد ہندوستان میں قومی مقاصد کی حیثیت سے قبول کرلی گئیں۔ دراصل برہمو تحریک کا مقصد تعلیم یافتہ طبقہ کو خاص طور سے ازسرِنو تعلیم دینا تھا۔ قوم کی بیداری کا کام اگرچہ بہت مشکل تھا لیکن رام موہن کے جانشینوں کی ان مستحکم کوششوں کے نتیجہ میں سرانجام پایا جو انھوں نے جدید ہندوستان کو بنانے میں صرف کی تھیں۔

۹۔ ہندوستان کا سفیر

ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ جب رام موہن جان ڈگبی (John Digby) کے ساتھ کام کر رہے تھے تو انھوں نے مغربی دنیا کی ترقیات کا مطالعہ بڑی تن دہی سے کیا۔ غالباً وہ اپنے زمانہ کے تنہا ہندوستانی شخص تھے جو دنیا کی تاریخ سے واقف ہونے کے ساتھ برطانیہ، امریکہ اور دوسرے غیر ملکوں کے لوگوں سے مسلسل رابطہ قائم کیے ہوئے تھے۔ نہ تو وہ خود ہی اس بات میں یقین رکھتے تھے اور نہ ہی وہ دوسروں کو اس یقین کی اجازت دیتے تھے کہ ہندوستانی اہلِ یوروپ کے مقابلے میں فطرتاً کم تر ہیں۔ وہ اس شان کے حامل تھے کہ کسی کو مساوی حیثیت سے زیادہ کوئی حیثیت دینا پسند نہ کرتے تھے۔ انھیں انگلینڈ کو دیکھنے اور انگریز لوگوں سے ملنے کی بڑی خواہش تھی اور وہ بذاتِ خود ان کے

طریقۂ تعلیم کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے ۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ان کی ابتدائی خواہشوں میں سے ایک خواہش برطانیہ کی یونیورسٹی میں پڑھنے کی تھی ۔ ستی کے خاتمہ اور برہم سماج کے مستحکم قیام کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ بالآخر اب وہ انگلینڈ اور مغربی ممالک میں عارضی قیام کر سکتے ہیں اور ۱۸۲۹ء میں آسمانی تائید سے انھیں اس کا موقع نصیب ہو گیا ۔

انگلینڈ کی سیاحت :

آپ جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں ابھی تک دہلی میں مغل شہنشاہ تھا جو برائے نام ہندوستان کا خود مختار تھا ۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اس کے کارکن کی حیثیت ۔ سے ملک کا انتظام کرتی تھی اور اس کو اُس کے محل اور دربار کی نگہداشت کے مصارف کے لیے سالانہ پنشن ادا کرتی تھی ۔ جب کمپنی تاجر کی حیثیت سے آئی تو برطانیہ کے بادشاہ سے انھیں اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ جزائر شرق الہند میں تجارت کر سکیں لیکن جب کمپنی نے ہندوستان کے کچھ علاقوں پر حکومت حاصل کرلی تو اس کی سرگرمیاں گورنمنٹ برطانیہ کے زیر اختیار آگئیں ۔ ۱۷۷۳ء سے برطانیہ سرکار نے کمپنی کی تجارتی اور سیاسی سرگرمیوں پر اپنے اختیارات میں اور اضافہ کر دیا تھا ۔ شہری، فوجی اور مالی تمام معاملات کی نگرانی کے لیے ایک بورڈ آف کنٹرول Board of Control قائم کر دیا گیا جس

میں کابینہ کے دو وزیر اور پریوی کونسل کے چار ممبران شامل ہیں۔ اس
نے ہندوستان کے لیے ایک گورنر جنرل کا تقرر کر دیا جو برطانیہ سرکار کا
ملازم ہوتا تھا اس لیے انتظامی معاملات میں نظم و ضبط اور نگرانی کے تحت
کمپنی ایک طرف تو گورنمنٹ برطانیہ کے کارکن کی حیثیت سے کام کرتی رہی
اور دوسری طرف شہنشاہ دہلی کے ایجنٹ کی حیثیت سے بھی۔ جس قدر زیادہ
برطانوی سلطنت وسیع ہوتی گئی اُسی قدر بادشاہ کی پنشن کم ہوتی گئی لیکن
وہ ابھی تک ہندوستانی شہریوں کو اعزاز بخشنے کا پورا حق رکھتے تھے۔
بھوٹان کے بارے میں رام موہن کے کامیاب سفارتی مشن کی رپورٹیں
سن کر اور برطانیہ کی نمایاں شخصیتوں کے ساتھ ان کا بلند مرتبہ معلوم ہونے
پر بادشاہ نے ۱۸۲۹ء میں انھیں راجہ کا خطاب بخشا اور انگلینڈ کے بادشاہ
کے سامنے مزید الاؤنس کے بارے میں اپنے معاملہ کو پیش کرنے کے لیے
سفیر کی حیثیت سے نامزد کیا۔ اس طرح رام موہن کو برطانوی عدالت میں
ہندوستان کا سب سے پہلا سفیر بننے کا مزید اعزاز حاصل ہوا۔ گورنر جنرل
کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے خطاب اور نامزدگی دونوں باتوں
کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لیکن رام موہن کے لیے یہ بات مانع نہ ہو
سکی اور وہ اپنے انگریز سکریٹری مارٹن (MARTIN) اور اپنے متبنّیٰ بیٹے
راجہ رام اور دو ملازموں کے ساتھ جہاز سے انگلینڈ کے لیے روانہ ہو گئے۔

اُس وقت تک نہر سویز وجود میں نہیں آئی تھی اور یورپ جانے کے لیے راس اُمید (CAPE OF GOOD HOPE) کا چکر لگا کر جانا پڑتا تھا۔ اس معاملہ میں بھی وہ سب سے پہلے (اوّل ہونے کی وجہ سے) برہمن تھے جنھوں نے ایسے وقت میں سمندر پار کیا جبکہ بحری سفر کو غیر ہندوانہ عمل بتلا کر مسترد کر دیا جاتا تھا اور ایسا کرنے والے شخص کو برادری سے خارج کرنے کی سزا دی جاتی تھی

اُن کا جہاز جب کیپ ٹاؤن پہنچا تو انھیں ایک ایسے حادثہ سے سابقہ پیش آیا جس نے انھیں ۱۰ ماہ تک لنگڑا بنائے رکھا لیکن جب انھوں نے کیپ ٹاؤن سے دُور خلیج میں دو فرانسیسی جہازوں کو انقلاب پسند فرانس کا جھنڈا لہراتے ہوئے دیکھا تو وہ اپنی تمام تکلیف کو بھول گئے اور فرانسیسی قوم کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے جہازوں پر گئے جس نے ۱۸۳۰ء کے انقلاب دوم میں کامیابی حاصل کر لی تھی اور اس برین (BOURBON) خاندان کو ختم کر دیا تھا جو ۱۸۱۵ء میں نیپولین کی شکست کے بعد پھر برسرِ اقتدار آ گیا تھا اور عوام کی خواہش پر ایک بادشاہ کا انتخاب کر لیا تھا۔ اس طرح پہلے انقلاب کے مخصوص مقاصد میں سے ایک کو حاصل کر لیا تھا۔

لیورپول میں پہنچنا: رام موہن بالآخر ۸ اپریل ۱۸۳۱ء میں لیورپول پہنچے

جہاں کے نمایاں لوگوں نے فوراً ہی انھیں گھیر لیا۔ مانچسٹر میں بھی اُن کا بہت
پُرجوش استقبال کیا گیا۔ انھوں نے ولیم روسکو (William Rosco)[1]
مورخ سے ملاقات کی جو ان کی آمد کا بڑے اشتیاق سے منتظر تھا۔ جب وہ
لندن پہنچے تو ان کی سب سے پہلی ملاقات مشہور فلاسفر جرمی بنیتھم
(Jermy Bentham) سے ہوئی جو ان کی پہلی خط و کتابت کے ذریعہ
اُن سے متعارف تھا۔ ایک چشم دید شخص کا کہنا ہے کہ جب لندن میں یہ
معلوم ہوا کہ عظیم برہمن فلاسفر رام موہن وہاں آپہنچے ہیں تو ملک کے
ممتاز ترین اشخاص ان کو ہدیۂ احترام پیش کرنے کے لیے جمع ہو گئے اور
وہ ریجنٹ اسٹریٹ (Regent Street) میں جہاں ان کی قیام گاہ
تھی مشکل ہی سے داخل ہو پائے۔ جب ان کا دروازہ صبح کے گیارہ بجے
سے شام کے چار بجے تک سواری گاڑیوں سے گھرا رہا تو جوش و خروش
کی اس مستقل حالت نے حقیقت میں انھیں بیمار بنا دیا (کیونکہ تمام دن
انھیں ہر ایک سے سیاسیات پر پُرجوش بحث کرنی پڑتی تھی) یہاں تک
کہ اُن کے معالجوں کو مُثبت طور پر اُن کے چپراسی کو حکم دینا پڑا کہ وہ ملنے
والوں کو مزید اجازت نہ دے۔ اُن کی سیاسی ہمدردیاں انگلینڈ کے ترقی
یافتہ طبقہ کے ساتھ تھیں جس کا نام WHIGS تھا (جو بعد کو LIBERALS
کہلایا) جس نے عوام کے حقوق کی حمایت اور بادشاہ کے اختیارات، گرجا گھر

اور شرفا کی حکومت کی حمایت کرتے تھے تاہم دونوں پارٹیوں کے رہنماؤں کی برابر طور پر عزت و توقیر کرتے تھے۔ برطانوی موحدین بھی کچھ کم مداح نہیں تھے جن کی تعداد اور جن کا اثر بڑی تیزی سے انگلینڈ میں بڑھتا جا رہا تھا۔

ہندوستانیوں کے سب سے پہلے سفیر:

اگرچہ شروع میں شہنشاہ دہلی کی سفارت کے لیے رام موہن کے خطاب کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے تسلیم نہیں کیا لیکن برطانوی عدالت نے اسے تسلیم کر لیا اور تعلیم یافتہ برطانوی اور روشن خیال لوگوں نے انھیں برطانیہ میں اہل ہند کا سفیر مان لیا۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ برطانیہ میں کمپنی کے ڈائرکٹران کے اعزاز میں ایک دعوت دینے پر مجبور ہوئے۔ چشم دید گواہ کا کہنا ہے کہ دیکھنے میں یہ ایک عجیب بات تھی کہ وہ برہمن جو بھوے، ہرن کا گوشت اور شیمپین (ایک قسم کی شراب) کے استعمال کرنے والوں سے گھرے ہوئے تھے چاول اور ٹھنڈے پانی کے سوا کچھ نہیں چھوتے تھے۔ گورنمنٹ برطانیہ کی نظر میں ان کی اہمیت اس امر سے ظاہر ہوگی کہ ان کو ہندوستانی معاملات پر ایک با اختیار کی حیثیت سے تسلیم کر کے برطانوی پارلیمنٹ کی مجلس منتخبہ (Select Committee) کے سامنے بلایا گیا جو اس سوال پر غور کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھی کہ آیا ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحقاق کی تجدید کی جائے یا اس کے ہندوستانی مقبوضات

کو پارلیمنٹ کے ذریعہ لے لیا جائے۔ رام موہن نے اس دعوت نامہ کو نامنظور کر دیا لیکن انھوں نے کمیٹی کے سامنے کچھ یادداشتیں رکھیں۔ ان میں سے ایک میں انھوں نے ہندوستانی کسانوں کو راحت دینے کے لیے وکالت کی تھی انھوں نے واضح کیا کہ جب ۱۷۹۳ء کے استمراری بندوبست نے بڑے بڑے جاگیرداروں کو اور زیادہ متمول بنا دیا تھا تو غریبوں کو اس سے کوئی بھی فائدہ نہیں پہنچا۔ انھوں نے کسانوں پر لگان میں کمی کرنے اور تکلفات و عیش پسندی کی اشیاء پر ٹیکس بڑھانے کی حمایت کی اور کلکٹر جیسے عہدوں پر ان انگریزوں کے مقابلے میں جنھیں دفتر کے لیے باہر سے درآمد کیا جاتا تھا کم تنخواہ پر ہندوستانیوں کا تقرر کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے ان باتوں پر بھی زور دیا کہ فارسی کے بجائے انگریزی کو سرکاری زبان بنا لیا جائے۔ مقدمات JURY (ججوں کی جماعت) کے ذریعے طے کیے جائیں۔ تمام ملک میں ضابطہ دیوانی اور ضابطہ فوجداری یکساں ہو۔ قانون کو وضع کرنے سے قبل عوام کے نمائندوں کے مشورے حاصل کیے جائیں۔ انھوں نے ذمہ داری اور اعتماد کے عہدوں کے لیے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے تقرر کے لیے بھی ایک زوردار دلیل پیش کی تاکہ ہندوستانی اور انگریز مساوات کی بنیاد پر ایک ساتھ مل کر کھڑے ہو سکیں۔

آزادی کا خواب: رام موہن برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان مساوات

کی بنیاد پر مستقل رشتوں کے حامی تھے۔ اس کا اظہار اُن کے ایک دوسری یادداشت سے ہوتا ہے جو انھوں نے برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کی تھی۔ اس یادداشت میں انھوں نے ہندوستان میں بہت سے انگریزوں کی آبادکاری کی حمایت کی تھی کیونکہ وہ اپنی مثال سے ملک میں صنعت اور زراعت کو ترقی دے سکتے تھے اور جدید تعلیم اور استدلالی غور و فکر کی اشاعت سے تعصبات اور اوہام پرستی کو دور کرنے میں مدد دے سکتے تھے جو ہندوستانی سماج میں عام طور پر رائج تھی مگر بد انتظامی یا کسی دوسری اتفاقی وجہ کی بنا پر انھوں نے برطانیہ حکومت سے ہندوستان کے آزاد ہو جانے کے امکان کو بھانپ لیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس حالت میں معزز آبادکاروں کی ایک بڑی تعداد سے ہندوستان یورپ کے عظیم ممالک کی سطح پر خوش حالی اور روشن خیالی کو لاکر دوسرے ایشیائی ممالک کا رہبر بن سکے گا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے پھر توقع ظاہر کی کہ دو دوست ملکوں کے درمیان دوستانہ اور بے حد مفید تعلق کو قائم رکھا جا سکے گا جیسا کہ ان کے معزز دوست آدم (ADAM) نے لکھا ہے کہ سب سے زیادہ دانشمندانہ اور سب سے زیادہ شریفانہ، سب سے زیادہ معقول اور سب سے زیادہ ہمدردانہ راستہ جس کو انگلینڈ ہندوستان کے لیے اختیار کر سکتا ہے یہ ہے کہ وہ جمہوری اداروں کو قائم کر کے یا انھیں منظوری

دے کر اُن میں تعلیم دینے کے ساتھ شہری اور سیاسی آزادی کے اصولوں کو تدریجی ترقی دے جس سے وہ اہلِ ملک کو اس قابل بنا سکے کہ وہ سرکار کی باگ ڈور خود اپنے ہاتھوں میں لے سکیں۔ اس طرح رام موہن سب سے پہلے ہندوستانی شخص تھے جنھوں نے قومی اور جمہوری خطوط پر ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھا تھا۔ درحقیقت اس معاملے میں انھوں نے پیغمبرانہ ذہانت کا ثبوت دیا ہے کیونکہ انھوں نے پہلے ہی اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ برٹش حکومت کو ہندوستان میں کم از کم ۴۰ یا ۵۰ سال تک رہنا چاہیئے تاکہ ہندوستان اپنی سیاسی آزادی کو بحال کراتے وقت بہت سی چیزوں کو ضائع نہ کر سکے۔ انگریز دوست کے نام ایک خط میں انھوں نے سرپرستی کے لیے مزید سو سال کا عرصہ تجویز کیا ہے۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ ہندوستان نے رام موہن کی وفات کے ۱۱۴ سال بعد آزادی کی دولت حاصل کی اور جدید جمہوریت کا خواب پورا ہوا۔

ایک کامیاب مشن :

ستمبر ۱۸۳۱ء میں شاہ برطانیہ کے ذریعے رام موہن کو شہنشاہ دہلی کے معتمد سفیر کی حیثیت سے سماعت کے لیے بلایا گیا۔ انگلینڈ کے لیے ان کا سفارتی مشن اس درجہ کامیاب ہوا کہ شہنشاہ کی پنشن میں اضافہ کی منظوری دے دی گئی لیکن رام موہن پورے طور پر اس سے مطمئن نہیں

ہوئے اور شہنشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ اس وقت تک اس پیش کش کو منظور نہ کریں جب تک کہ انھیں ان کا پورا مطالبہ نہ مل جائے۔ رام موہن کے کچھ دوسرے سفارتی مقاصد بھی تھے جو انھوں نے خود اپنے اوپر عائد کر لیے تھے ان میں سے ایک قدامت پرست ہندؤں کے ذریعے بھیجی گئی عرضداشت کی مخالفت کرنا تھا (جن میں سے بہت سے خطاب یافتہ امراء تھے)۔ یہ عرضداشت پریوی کونسل میں خاتمہ ستی کے قانون کی تنسیخ کے متعلق بھیجی گئی تھی۔ عرضداشت بالآخر ناکام ہو گئی۔ اس کے لیے ان کی ہوشیار وکالت باعث تشکر ہے۔ دوسرا سفارتی مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجدید شدہ چارٹر میں ہندوستان کے لیے مفاد حاصل کرنے سے متعلق تھا۔ اس چارٹر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو برطانوی پارلیمنٹ کے زیر اختیار ہندوستان پر حکومت کرنے کے اہل بنایا گیا تھا۔ یہ تجدید ۱۸۳۳ء میں ہونے والی تھی جو مفادات حاصل ہوئے وہ زیادہ نہیں تھے لیکن ان کے لیے بھی کمپنی کے طاقتور ڈائرکٹروں کے خلاف لڑنا پڑا۔ دونوں پارٹیوں کے برطانوی سیاست دانوں میں چونکہ ان کا مرتبہ بلند تھا اس لیے وہ اس مخالفت پر غالب آ گئے۔

مغرب میں ہندوستان کے کلچر کی حمایت:

رام موہن کا تیسرا اور سب سے اہم مشن مغرب میں ہندوستان

کے کلچر کو پیش کرنا تھا۔ کچھ انگریز حکام اور عیسائیت کی تبلیغی جماعتوں نے ہندوستان کو قدیم مشرکوں کے ملک کی شکل میں رنگ کر پیش کیا تھا جنھیں خود ہی سے محفوظ کرنے کی ضرورت تھی۔ انگریزوں نے اس تصویر کو بجنسہٖ تسلیم کر لیا اور ہندوستانیوں کے جسم کی گندمی کھال کی وجہ سے ان کو اس من گھڑت کہانی میں یقین ہو گیا کہ وہ فطری طور پر سفید جسم رکھنے والے انگریزوں کے مقابلہ میں کم تر ہیں۔ رام موہن نے اس خیالی افسانے کو باطل قرار دینا چاہا۔ ان کا یقین تھا کہ ویدانت کا موحدانہ فلسفہ نہ صرف ہندوستان کا عظیم الشان ورثہ ہے بلکہ دنیا کا سب سے اعلیٰ فلسفہ ہے اور یہ کہ وہ تمام مذاہب کے اتحاد کی بنیاد فراہم کرتا ہے اور تمام مہذب فرقوں کو باہم ملنے اور باہمی فکر و فہم، تعاون اور مساوات کی بنیاد پر سماجی ترقی اور انصاف کے لیے کام کرنے کے قابل بناتا ہے۔

فرانس کی سیاحت:

۱۸۳۲ء میں رام موہن نے فرانس کی سیاحت کی جہاں ایک عالم اور ہندوستانی نمائندہ کی حیثیت سے اُن کی شہرت پہلے پھیل چکی تھی فرانس کے بادشاہ اور امراء نے ان کا پُرجوش استقبال کیا۔ اس عارضی قیام کے دوران قوموں کے مابین سیاسی تعلقات پر اُن کے فکر و ادراک کی گہرائی کا انکشاف ہوا۔ پرنس ٹیلی رینڈ (Prince Tellyrand) کے نام جو

ایک فرانسیسی وزیر خارجہ (Foreign Minister) اور مدبر تھا ایک ایسے خط میں جواب تک مشہور ہے تجویز کیا تھا کہ دو قوموں کے مابین سیاسی اختلافات کو طے کرنے کے لیے ایک ایسی مجلس کی تشکیل کی جائے جو ہر ملک کی پارلیمنٹ سے مساوی تعداد میں لیے گئے ممبران پر مشتمل ہو اور دو ملکوں کے مابین سیاسی اختلافات کا ہر معاملہ اس کے سامنے پیش کیا جائے اور دونوں قومیں اکثریت کے فیصلے کو تسلیم کریں اور اس کا چیرمین (صدر مجلس) یکے بعد دیگرے ایک سال کے لیے ہر قوم سے منتخب ہو اور جلسہ کا مقام ایک سال ایک ملک میں اور دوسرے سالوں میں دوسرے ملکوں کے حدود میں تجویز کیا جائے۔ ایسی مجلس کے ذریعے وہ تمام اختلافی مسائل خواہ سیاسی ہوں یا تجارتی جو آئینی سرکار کی مدد سے کسی دو مہذب ملکوں کے باشندوں پر اثر انداز ہوں، دوستانہ اور بجا طور پر اطمینان بخش صورت میں طے کیے جاسکتے ہیں اور اس طرح نہایت بھرپور امن اور دوستانہ احساسات کو ان کے درمیان نسل در نسل قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس خیال کو ترقی دینے اور اس کردار کی سب سے پہلی مستقل تنظیم انجمن اقوام کو قائم کرنے میں دنیا کو قریب تقریباً سو سال سے زیادہ کا عرصہ درکار رہا تاکہ بین الاقوامی وساطت کے ذریعے قوموں کے درمیانی جھگڑوں کو طے کیا جاسکے۔

اس زمانہ کے لکھے گئے کچھ ذاتی خطوط ظاہر کرتے ہیں کہ رام موہن

ایک ممبر کی حیثیت سے برطانوی پارلیمنٹ میں داخل ہونے کے متعلق سوچ رہے تھے اور وہ اس بارے میں کچھ ممتاز سیاسی دوستوں کو متاثر کر رہے تھے مگر اس اسکیم کے ساتھ وہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکے کیونکہ اس کی ایک ٹھوس شکل اختیار کرنے سے قبل ہی کچھ ہی مہینوں کے عرصہ میں اُن کے خالق نے اُنھیں بلا لیا۔

10۔ چراغ گُل ہو جاتا ہے

۲۰ سال تک رام موہن باوجودیکہ بھاری سرگرمیوں کے باعث پہلے
ی اپنی تندرستی کھو چکے تھے تاہم آرام کیے بغیر سخت مخالفت، ایذا رسانی
ور اُس عام جہالت کے خلاف مسلسل جدوجہد کرتے رہے جو خود اُن کے
پنے ملک میں اور دوسرے ممالک میں پھیلی ہوئی تھی۔ انھوں نے قریب قریب
تن تنہا وہ سب کچھ کیا تھا جو ایک آدمی کر سکتا ہے اور یہ حق حاصل کر لیا تھا
کہ وہ اب آرام کریں۔ انھوں نے بھاری کام سے فراغت پانے کے لیے
برسٹل کے ساحلی صحت گاہ میں سٹیپلیٹن گرو (Stapleton Grove)
نام کے مکان میں چند وفادار دوستوں کے ساتھ جو ان کی تندرستی کے بارے
میں فکرمند رہتے تھے آرام کرنا چاہا۔ یہاں پہنچنے کے کچھ دنوں بعد وہ بیمار
پڑ گئے۔ ان کا کام سے تھکا ہوا دماغ منتشر ہو رہا تھا اور جلد ہی ان کی بیماری

سرسام میں تبدیل ہوگئی۔ ان کے دوستوں نے مخلصانہ طور پر ان کی تیمارداری کی جن میں ڈیوڈ ہیر (DAVID HARE) کی بہن اور مس میری کارپینٹر بھی شامل تھیں۔ وہ اپنے جاگنے کے اوقات کو عبادت میں گزارتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی قوتِ گویائی جاتی رہی اور ۲۷ ستمبر ۱۸۳۳ء کو دن کے ۲ بج کر ۲۵ منٹ پر انتقال فرما گئے۔

ان کی سوانح نگار مس سوفیہ ڈابسن کالٹ (Miss Sophia —Dobson Collett) لکھتی ہیں کہ "اس موت کے منظر کی جذباتی کیفیت اور دل گدازی ہندوستان کے حسرت بھرے تخیل میں دیر تک قائم رہے گی۔ نا آشنا اور دور کا مغربی خطہ، موسم خزاں کے چاند کی چاندنی میں سویا ہوا خوشنما دیہی منظر گاہ، چاندنی کے نقرئی پردۂ راز میں نمایاں دکھائی دینے والا تنہا دیہاتی مکان جہاں ہر ایک چیز مکمل سکون کے لیے خاموشی میں لپٹی ہوئی تھی۔ فطرت اور رات کا باہم ملنا جو ابدی سکون (خدا) کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کے اندر عظیم نجات دہندہ (رام موہن) کی روح جو فنائیت کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کر رہی تھی اور جس نے بالآخر آزادی اور سکون راز کو پالیا تھا جس کو سمجھنے کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ یہ سب اشیاء رام موہن کے ان روحانی مورتوں کے لیے ایک پُراسرار یادگار رہے جو روشن خیال اور آزاد مشرق میں کروڑوں کی تعداد

ثل ہونے والے ہیں۔

چونکہ رام موہن ایک ہندو تھے اس لیے ان کے جسم کو عیسائیوں کے کسی قبرستان میں دفن نہیں کیا جا سکتا تھا اور لاش کا جلانا اس وقت برطانیہ میں غیر قانونی تھا اس لیے ان کی میت کو احترام کے ساتھ سٹیپلٹن گروو (Stapleton Grove) کے احاطے میں دفن کر دیا گیا۔ دس سال کے بعد ان کے ساتھی اور دوست دوارکا ناتھ ٹیگور انگلینڈ پہنچے اور برسٹل کا متبرک سفر کیا اور ان کے قبر کی باقی ماندہ مٹی کو برسٹل کے قریب آرنو کی گھاٹی (ARNO'S VALE) کے قبرستان میں منتقل کرا دیا۔ ۲۹ سال اور گزر جانے کے بعد ان کے سنگ مزار پر ذیل کا کتبہ نقش کیا گیا:

اس پتھر کے نیچے راجہ رام موہن کی نعش آرام فرما ہے
جو خدا کی وحدانیت کا راست باز اور ثابت قدم معتقد تھا
جس نے اپنی زندگی پُر جوش عقیدت کے ساتھ صرف
ایک خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دی
اپنی فطری صلاحیتوں سے جس نے بہت سی زبانوں میں
مکمل مہارت پیدا کر لی تھی
اور جس نے جلد ہی خود کو زمانہ کے عظیم ترین علماء میں
ممتاز کر دیا تھا۔ ہندوستانی عوام کی سماجی، اخلاقی

اور مادی حالت کو بہتر بنانے کے لیے اُن کی انتھک محنتیں،
بُت پرستی اور ستی کی رسم کو ختم کر دینے کے لیے اُن کی
مخلصانہ کوششیں اور خدا کی عظمت کو بلند کرنے اور انسان
کی فلاح کو فروغ دینے کے لیے اُن کی ثابت قدم اور
پُرجوش حمایت اہلِ ملک کے دلوں میں بطور یادگار ہمیشہ
رہے گی۔

یہ تختی

اس رنج اور فخر کو ضبطِ تحریر میں لائے ہوئے ہے جس
کے ذریعے اُن کے پسماندگان اُن کی یاد کو برقرار رکھتے ہیں
وہ *۱۷۷۴ء میں بمقام رادھا نگر (بنگال) میں پیدا ہوئے اور
۲۰ ستمبر ۱۸۳۳ء کو برسٹل میں وفات پائی۔

---

* ایک غلطی کا ازالہ: رام موہن دراصل ۱۷۷۲ء میں پیدا ہوئے۔

11- راستہ بنانے والا رہنما

اس طرح ایک بڑی ہستی جس نے اعلیٰ ڈھنگ سے زندگی گزاری، وفات پاگئی لیکن جسمانی موت کے باوجود ان کی روح تمام عرصہ زندہ رہی اور سماج کی نئی زندگی اور قومی نشو ونما کی تکمیل کے لیے تشدد اور کشمکش کی حالت میں بھی آنے والی نسلوں میں روح پھونکتی رہی۔

ہندوستان میں بیداری کا آغاز کرنے والا:

رام موہن سب سے پہلے ہندوستانی شخص تھے جنھوں نے ہندوستان کی بگڑی ہوئی اور جامد سوسائٹی پر برطانیہ حکومت کے ذریعے رائج کردہ دورِ جدید کے تصادم کی اصل فطرت کو محسوس کرلیا تھا اقتصادی، کلچرل اور سیاسی تمام محاذ پر ایک چیلنج تھا۔ انھیں یقین تھا کہ اس چیلنج کا

مقابلہ کرنا ضروری ہے اور یہ کہ ہندوستانیوں کو ایک قوم بننے کے لیے مغربی کلچر سے سبقت لے جانی چاہیئے۔ انھوں نے ہندو سماج کی اصلاح پر زیادہ توجہ صرف کی کیونکہ ہندوؤں کی نہ صرف ایک بھاری اکثریت تھی بلکہ وہ آپس میں غیر متحد اور دوسروں سے رابطہ منقطع کیے ہوئے تھے، اور جہالت و اوہام پرستی میں غرق تھے۔ رام موہن نے ہر قدم پر قدامت پرست لوگوں کی سخت مخالفت کے باوجود عوام میں اس خودداری کو بیدار کیا جس کو انھوں نے پنڈتوں، جاگیرداروں، حکمرانوں اور انھیں کی طرح جابرانہ ایجنسیوں کی طویل عرصہ کی غلامی کے باعث فراموش کر دیا تھا۔ وہ خاص طور پر اُن غیر متحد اور امداد باہمی سے ناآشنا طبقوں کے اتحاد کے بنیادی اصول کو تلاش کرنے میں مصروف رہے جن میں ہندوستانی سماج منقسم تھا۔ تمام مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ یہ اعلان کرنے کے قابل ہو سکے کہ سب سے اعلیٰ اصول جو ہندوستان کو باہم جوڑ سکتا ہے اور تمام قوموں کے لوگوں کو افہام و تفہیم کا بہتر مقام بہم پہنچا سکتا ہے ہندوستان کے قدیم ورثہ ہی میں مل سکتا ہے۔ ہم ان کے کارنامۂ زندگی کے اس پہلو کو خاص طور پر بیان کرتے ہیں کیونکہ یہ اس جدت پسندی کی صفت کو واضح کرتا ہے جس کو وہ ہندوستان کے لیے چاہتے تھے۔ رام موہن کی وفات کے بعد کی صدی شاہد ہے کہ ہندوستان کے لوگوں میں ایک عظیم بیداری

آئی ہے جو سماجی کایا پلٹ اور ذہنی انقلاب کی چھاپ لیے ہوئے ہے۔ وہ بنیادیں جن سے انھیں قوتِ حیات ملی ہے رام موہن کے فرمانے کے بموجب یہ ہیں۔ اوّل ہندوستان کے اعلیٰ ترین کلچرل ورثہ کا پُر زور دعویٰ کرنا جو ہندوستان کے مختلف لوگوں کو یکجا کرنے اور متحدہ قوم بنانے میں سیمنٹ کا کام دے سکتا ہے۔ دوم مغربی تہذیب و تمدن کا بخوبی سمجھنا اور اس کو اپنے مطابق بنا لینا۔ اس طرح وہ اس بیداری کا آغاز کرنے والے تھے جس نے ہندوستان کو جدید دنیا (علمی ترقی اور استدلالی فکر کی دُنیا) سے روشناس کرایا۔

آزاد قوم کی حیثیت سے ہندوستان کا ظہور:

اپنے زمانہ سے بہت آگے رام موہن نے آزاد قوموں کی دُنیا میں ہندوستان کا ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اُبھرنا پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ وہ ہندوستانی قومیت کے راستہ کی بڑی بڑی رکاوٹوں کو بھی پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ قومیں اپنے تمام شہریوں کی مستقل فلاح کے کسی ایک مشترک معاملہ میں وفادار ہونے کی وجہ سے باہم متحد ہوتی ہیں اور ہر شہری کو سچے دل سے اپنے ساتھیوں کے بہبود کی ذمہ داری کو محسوس کرنا چاہیے۔ ہر آزاد سماج کا یہی مقصد ہونا چاہیے۔ ہر وہ چیز جو اس مقصد کی تلاش میں حائل ہو اس کا انکار کر دینا چاہیے۔ وہ روایات و معمولات اور رسم و رواج جو لوگوں کے مختلف

فرقوں میں تقسیم پیدا کرنے والے اور انھیں قائم رکھنے والے ہوں دُور کر دینے چاہئیں اور ایک نیا سماجی اخلاق سماجی مساوات اور تعارف کی اس بنیاد پر کہ انسان کی فلاح مذہب نیز سیاست کا مقصد ہے قائم کیا جانا چاہیے۔

یہ ہی مقصد ان وسیع سماجی اصلاحات کی تہ میں تھا جن کو بروئے کار لانے کے لیے رام موہن نے جدو جہد کی تھی اس لیے انھوں نے ہر سماجی بے انصافی کی مخالفت کی۔ وہ عورتوں کی آزادی کے معاملہ میں ان کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے حمایتی تھے وہ ان کے متساوی حقوق کے لیے لڑتے رہے اور کثرت ازدواج نیز صغیر سنی کی شادیوں کی مخالفت اور بیواؤں کی دوبارہ شادی کرنے کی حمایت کرتے رہے۔ ذات پات کی تفریق کو وہ خاص کر نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ وہ سماج کو منقسم کیے ہوئے تھی اور ہندوستانی حب الوطنی کی نشو ونما کی راہ میں مزاحم تھی۔ ان کی ستی کی مخالفت انسانیت نیز سماجی انصاف کی بنیادوں پر تھی۔

ہندوستان کے لیے جدید تعلیم کی اہمیت کا احساس:

رام موہن اس لحاظ سے بھی سب سے پہلے ہندوستانی تھے، جنھوں نے ہندوستانی سماج کی تعمیر میں جدید طرز کی تعلیم کی اہمیت کو محسوس کیا۔ وہ خود بہت سی زبانوں کے ماہر تھے مثلاً سنسکرت، عربی، فارسی، عبرانی اور جدید یورپی زبانیں جیسے انگریزی، فرانسیسی اور اسپینی۔ انھوں

ــــ یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ پرانی زبانیں جدید استدلالی فکر کی اشاعت کے لیے ناکافی ہیں ۔ وہ ایسے اسکولوں اور کالجوں کو جن میں ذریعۂ تعلیم انگریزی رکھا گیا قائم کرنے کی تحریک کے بانی ہوئے اور انھوں نے گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی پر لارڈ امہرسٹ (LORD AMHERST) کے نام ایک یادداشت لکھ کر مخالفت کی چنگاری کو بھڑکا دیا۔ اُن کی وفات کے دو سال بعد گورنمنٹ نے اُن کے نقطۂ نظر کو قبول کرلیا۔ ایک مثالی ہندوستانی اسکول کے بارے میں اُن کا تصور اس اسکول سے ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے اینگلو ہندو سکول کے نام سے قائم کیا تھا جہاں ہمہ گیر مذہب کے اصول اور مغربی سائنس، فلاسفی اور ادب کے ساتھ ساتھ پڑھائی جاتی تھی۔

ہندوستان میں پریس کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے سب سے پہلا صحافی :

رام موہن ہندوستان کے سب سے پہلے صحافی بھی تھے جنھوں نے ایک آزاد پریس کا بلند معیار قائم کیا جو جدید ہندوستان کی قابلِ فخر روایت ہے۔ جو اخبارات انھوں نے شائع کیے وہ ہندوستانی اور غیر ملکی معاملات پر اُن کی واقعیت پسند تنقید کے لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں اور ان کا احتسابی ضابطہ (Consorship Ordinance) کے خلاف احتجاج کے طور پر فارسی اخبار کا بند کردینا ایک ایسی مثال ہے جس کی بعد میں آنے والے

ہندوستان کے وطن پرست اخباروں نے تقلید کی ہے۔ سپریم کورٹ اور پریوی کونسل میں آرڈیننس کے خلاف اُن کی عرضداشت پریس کی آزادی کا ایک عہد نامہ ہے۔ ابتدائی بنگالی نثر نگاروں میں بھی وہ سب سے پہلے نثر نگار ہیں اور ان کے اُپ نشاد کے بنگالی ترجمے اُن کے متعلق اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ وہ لوتھر (LUTHER) وکلف Wycliffe اور سائیرل Cyril اور میتھوڈیس (METHODUIS) کے درجہ کے وہ شخص ہیں جنھوں نے مذہبی ادب کو نجات دلائی ہے۔

ہندوستان میں سیاسی فکر کو جنم دینے اور اس کی نشو و نما کرنے میں رام موہن کے تعاون کو دو زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ ہندوستان میں اپنے زمانہ کے تنہا شخص تھے جو مغرب کے سیاسی فکر اور تحریکوں کی ترقی کا گہرا علم رکھتے تھے اور انسان کے لیے مساوات اور اظہار خیال کی آزادی کے حقوق کے مخلص حامی تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے پریس کی آزادی کو ختم کر دینے اور قانونی عدالتوں میں اہل ہند اور اہل یوروپ کے درمیان فرق و امتیاز برتنے کے خلاف رائے عامہ کی تنظیم کی۔ جب ۱۸۳۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید ہونے والی تھی تو وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اجارہ داری کے خلاف بھی لڑے۔ انھوں نے جرأت کے ساتھ برطانیہ کے اس مغرور مقروضہ کے خلاف بھی احتجاج

کیا کہ ایشائی باشندے اور سلطنت کے انتظام میں اہلِ یورپ کی نسبت کم ذہین اور کم اہل ہیں اور اپنی پیش بینی سے انھوں نے وہ وقت دیکھ لیا تھا جبکہ ہندوستانی خود حکومت کر رہے ہوں گے اور یہ کہ اُس وقت تک انگریزوں کی سرپرستی سے پورا فائدہ اٹھایا جانا چاہیئے۔

دُنیا کا شہری:

دوسرا زاویہ رام موہن کی اس حیثیت سے تعلق رکھتا ہے کہ وہ دُنیا کے شہری تھے۔ اُن کی ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ تھیں جو آزادی اور جمہوریت کے لیے لڑتے رہے۔ اسپینیوں کی امریکی نوآبادیات ۱۸۱۱-۲۳ء کی آزادی سے انھیں بے حد خوشی ہوئی نیپلس (NAPLES) میں سن ۱۸۲۰ء کے انقلاب کی ناکامی نے انھیں اس قدر مایوس کر دیا کہ انھوں نے اپنے تمام پروگرام منسوخ کر دیے۔ سن ۱۸۳۰ء کے دوسرے فرانسیسی انقلاب کو انھوں نے آزادی کی فتح قرار دے کر خوش آمدید کہا۔ برطانیۂ عظیم Great Britain میں اصلاحی بل (Reform Bill) کے خلاف تحریک میں انھوں نے Whigs (لبرل) LS (the Liberals) کا سرگرمی سے ساتھ دیا اور اپنے فارسی کے اخبار میں آئرلینڈ میں انگریزوں کی پالیسی پر سخت تنقید کی۔ ان کے مادرِ وطن سے متعلق اُن کے سیاسی نظریات اُن کے بین الاقوامی نظریہ ہی کا ایک جُز تھے۔ ہم پہلے ہی اُن کے

ایک بہت اہم خط کو دیکھ چکے ہیں جو انھوں نے فرانس کے وزیرِ خارجہ (Foreign Minister) کے نام تحریر کیا تھا اور جس میں انھوں نے سیاسی اور دیگر معاملات کو طے کرنے کے لیے قوموں کی ایک مجلس کو تشکیل دینے کی تجویز پیش کی تھی جس میں انھوں نے قریب ۹۰ سال پہلے انجمن اقوام کی پیش بینی فرمائی تھی۔

ترقی پسند ہندوستانی معاشی تنظیم میں سب سے پہلا رہنما:

معاشی تنظیم کے میدان میں بھی رام موہن ترقی پسند ہندوستانی اہلِ فکر لوگوں کے رہنما تھے۔ انھوں نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ استمراری بندوبست کے نتیجہ میں زمیندار مزید متمول اور کسان لوگ پہلے سے زیادہ مفلس بن گئے ہیں۔ انھوں نے اُن کے لگان کو روک دینے اور ان میں کمی کرنے پر بحث کی اور یہ کہ سرکاری آمدنی میں جو خسارہ آئے اس کو عیش پسندیوں کی اشیاء پر ٹیکس لگاکر پورا کیا جائے۔ انھوں نے انگریز تاجروں اور حکمرانوں کے ذریعہ ہندوستانی وسائل و ذرائع کے مستقل نکاس کو بھی واضح کیا۔

انگریزی عدالت میں ہندوستان کے سب سے پہلے سفیر ہونے سے کہیں زیادہ اعزاز رام موہن کو اس بات سے حاصل ہوا کہ وہ دُنیا میں بالمقابل دینیات کے باقاعدہ مطالعہ کرنے والے پہلے شخص تھے۔ تمام دُنیا کے علماء اس لحاظ سے اُن کے مرہونِ منت ہیں۔

بہرحال رام موہن رائے سب سے پہلے شخص تھے جنھوں نے دُنیا کو ہندوستان سے اور ہندوستان کو دنیا سے واقف کرایا۔ باہمی گفت وشنید کے طریق عمل نے جس کو انھوں نے شروع کیا تھا بعد کے زمانہ میں مقدار اور رفتار کے لحاظ سے ترقی پائی ہے۔ ان کے سوانح نگار نے گزشتہ ۶۰ سال پہلے لکھا تھا کہ "اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی تقدیر میں آئندہ جو کچھ بھی ملنے والا ہے اس کا ایک بڑا حصہ رام موہن رائے کی زندگی اور اُن کے کام کی بدولت حاصل ہوگا اور نہ صرف ہندوستان کی تقدیر بلکہ مشرق ومغرب کا بے مثل اختلاط بھی جس سے کچھ پیشتر کی حالت میں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ انسانی ترقی کے یوروپی اور ایشیائی چشمے جو پہلے ایک دوسرے کو اکثر متاثر کر چکے ہیں اب انسان کی اجتماعی ترقی کا بحری دریا بننے کے لیے ایک سنگم پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس عظیم مشرقی سوال کے سامنے جو صنعتی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی لامحدود شاخیں رکھتا ہے موجودہ زمانہ کے بین الاقوامی مسائل اور ان میں سب سے زیادہ سنگین معاملات بھی نہایت حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ ان لامحدود امکانات کے ظہور کا قریب ہونا اس آدمی کی تصویر کو نمایاں طور پر پیش کرتا ہے جن کی زندگی کی کہانی کو ہم نے بیان کیا ہے وہ اگرچہ پیغمبرانہ طرز کے انسان نہ تھے لیکن کم ازکم اس انقلاب کا پیش رو اشارہ ضرور تھے جو آنے والا ہے"۔

ہندوستان اور انسانیت نے تعصب، جہالت اور خود غرضی کی مورچہ بندیوں کو دور کرکے بتدریج تکلیف و درد کے ساتھ ان مقاصد کے حصول کے لیے ترقی کی ہے جن کو رام موہن نے سو سال پہلے تجویز کیا تھا آزادی ہندوستان کو ایک ایسی دنیا کے سامنے لائی ہے جو تیزی سے نئی قوموں، عظیم سائنسی تحقیقات، بھدی اور بھیانک ترقیات (مثلاً لڑائیاں اور انسانیت کو ایٹمی ہتھیاروں کی دھمکیوں) کے اُبھار کے ساتھ بدل رہی ہے اور جس نے انسانی اخوت کی ضرورت کے لیے انسان کے ضمیر کو بیدار کیا ہے مگر انسان کے عظیم مقاصد وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ شائستہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ترقی کی شاہراہ لامحدود اور بلند ہے اور انسان کو راہِ راست پر قائم رہنے کی غرض سے کمزوریوں اور ناکامیوں پر بار بار حاوی آنا چاہیئے۔ رام موہن کا پیغام تمام عرصہ زندہ اور اہمیت کا حامل رہا ہے۔ وقت بدلتا رہتا ہے اور اس لیے انسان کی سوسائٹی کے بنیادی مسائل کی شکلیں بھی بدلتی رہتی ہیں لیکن مابعد الطبیعات اور انسانی رشتوں کے نمایاں مسائل اور اقتصادی، سیاسی اور سماجی آزادی کے مسائل حل ہونے کے لیے باقی رہ جاتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ہندوستان کی ترقی کے وسیع خطوط سو سال پہلے رام موہن نے ہی بنائے تھے۔ ہندوستان کی آرزوؤں کو رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کی دعائیہ نظم میں بہت عمدہ قلمبند

گیا ہے جس میں رام موہن رائے کی رُوح کارفرما ہے :

جہاں دماغ بے خوف و خطر اور سر اعزاز سے بلند ہے۔

جہاں علم آزاد اور تنگ گھریلو دیواروں سے دُنیا کو تقسیم نہیں کیا گیا

ہے۔

جہاں الفاظ سچائی کی گہرائیوں سے ادا ہوتے ہیں۔

جہاں انتھک کوششیں تکمیل کی جانب اپنے بازوں کو پھیلاتی ہیں

جہاں فہم و ادراک کے صاف شفاف چشمہ نے مردہ طبیعتوں کے

سنسان ریگستان میں اپنا راستہ گم نہیں کر دیا ہے۔

جہاں ہمیشہ وسیع خیالوں اور کارناموں میں تیرے ذریعہ مسلسل

آگے کی طرف دماغ کی رہنمائی کی جاتی ہے۔

اے میرے مالک اسی آزادی کی جنّت میں میرا ملک بیدار ہو!

ننھے منے گیت

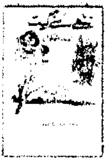

مصنف: ایدا رتا کھڑوال

پہلا ایڈیشن

صفحات: 62، قیمت: 13

ہند کی مایۂ ناز ہستیاں و دیگر مضامین

مصنف: بی۔ شیخ علی

پہلا ایڈیشن

صفحات: 176، قیمت: 31

فسانہ عجائب

مصنف: رجب علی بیگ سرور

تیسرا ایڈیشن

صفحات: 83، قیمت: 16

دوربین

[illegible]

پہلا ایڈیشن

صفحات: 247، قیمت: 85

Rs. 16/=